کون ادنیٰ
کون اعلیٰ

مؤلفہ

صادق ندیم

بار اول	۱۰۰۰
ناشر	عبدالحلیم گیلانی
مطبع	ثنائی برقی پریس لاہور
کتابت	محمد اسلم نقشبندی مجددی
قیمت	پانچ روپے

عوامی کتاب مرکز۔ ۲۔ ہسپتال روڈ لاہور

فرانسیسی ادب کے شاہکار

فہرست

تعارف

کہا جاتا ہے کہ فرانس ایک ایسا ملک ہے۔ جہاں انسانی حقوق کو پامال نہیں ہونے دیا جاتا۔ جب بھی ملک پہ کوئی نازک وقت آیا ہے۔ تو عوام حق کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ حال ہی کا --- واقعہ ہے۔ کہ فرانس کے طالب علموں نے ڈیگال جیسے مردِ آہن کی حکومت کو متزلزل کر کے رکھ دیا۔ ۱۹۶۲ء میں الجزائر کے معاملہ میں بھی فرانسیسی عوام نے حق کا ساتھ دیا اور ریفرنڈم کے ذریعہ الجزائر کی آزادی کی حمایت میں فیصلہ دیا۔

اسی طرح اور کئی کٹھن حالات میں بھی فرانسیسی روایت پرست عوام نے مقدور بھر انسانی بنیادی حقوق کو پامال ہونے سے بچایا۔ اور اپنی آزادی پر آنچ نہ آنے دی۔ ۱۹۴۰ء میں دیغے نے سیاسی پناہ گزینوں، یہودیوں اور فرانسیسی افواج کو ہٹلر کے سپرد کرنے پہ محض اس لئے راضی ہو گیا۔ کہ وہ فرانس کے کچھ علاقہ اور آبادی کے زیادہ حصّہ کو بچا سکے۔ یہ اخلاقی اقدار کی موت تھی۔ حزب اختلاف نے اعلان کیا کہ جملہ خدشات بے بنیاد ہیں اور اخلاقی موت مرنے کی بجائے یہ زیادہ آسان ہے کہ ہم عزتِ نفس کی خاطر بُری سے بُری صورت

عمل برداشت کرنے کو تیار ہو جائیں۔ نتیجۃً عوام کی جیت ہوئی اور حکومت کو جھک جانا پڑا۔

۱۸۹۳ء میں رفاہِ عام کے وزیر بے ہانت نے اپنے سرکاری مرتبہ کو پانامہ کے معاملہ میں ناجائز استعمال کیا تو اسائنز کی عدالت میں اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ فرانس کے عوام نے ہی جمیلہ الجزائری کے معاملہ میں میں حکومت کی بجائے جمیلہ کا ساتھ دیا اور وزیر جنگ ایم میسمر اور الجزائر کے کمانڈر انچیف جنرل ایلرٹ کے خلاف جمیلہ کی طرف سے مقدمہ دائر کیا۔ سارے ایوانِ حکومت میں زلزلہ آ گیا۔ گو ایوئین کے معاہدہ کے تحت عوام نتائج سے آشنا نہ ہو سکے۔

اس زندہ قوم میں موپساں نے وہ اخلاقی کوڑھی اور شریف و سادہ انسان تلاش کئے ہیں، جن کا وجود قوموں کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ حقیقت، صداقت اور تاریخ کا دامن تھام کر موپساں نے ایسی کہانیاں لکھی ہیں جو ہمارے کہانی نویسوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتی ہیں۔

صادق ندیم نے بڑے پیارے اور سلجھے ہوئے انداز میں چند کہانیوں کا ترجمہ کیا ہے۔ ان کا یہ کارنامہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی مقام پر بھی محسوس نہیں ہوتا کہ کہیں کوئی پیچیدگی رہ گئی ہے۔

قاضی ذوالفقار احمد۔

کون ادنیٰ ـــــ کون اعلیٰ

بہت دنوں سے باقی ماندہ فوج شہر میں ماری ماری پھر رہی تھی وہ باقاعدہ فوجی نہ تھے۔ بلکہ منتشر گروہ تھے۔ اُن کی داڑھیاں لمبی اور غلیظ تھیں۔ وہ پھٹی ہوئی وردیاں پہنے بغیر کسی جھنڈے کے چل رہے تھے۔ وہ کسی رجمنٹ کی طرح منظم نہ تھے۔ سب گھسے پھٹے اور شکستہ حال معلوم ہوتے تھے۔ ان میں نہ قوتِ فکر تھی، اور نہ عزم۔ وہ محض عادتاً چل رہے تھے۔ اور ٹھہرنے کے ساتھ ہی تھک کر گر پڑتے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ امن پسند لوگ تھے۔ جنہیں دفاع کے لئے تیار کیا گیا تھا اور جو بندوق کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ کچھ چھوٹے چھوٹے دستے تھے جنہیں ہوشیار رہنے کا حکم تھا۔ جو فوراً خطرے کا احساس کر لیتے تھے، گرمجوشی دکھانے میں پیش پیش تھے۔ وہ حملہ کرنے کے لئے بھی تیار رہتے تھے۔ اور بھاگنے کے لئے بھی۔

ان کے ساتھ سُرخ وردی والے وہ سپاہی بھی تھے جو بڑی جنگ میں شامل ہونے والوں میں سے بچے تھے۔ کچھ توپ خانہ کے سپاہی بھی ان مختلف قسم کے پیادہ سپاہیوں کے ساتھ شامل تھے۔ کچھ گھوڑ سوار جو اس وقت پیادہ چل رہے تھے۔ سر پہ چمکدار خود پہنے ہوئے تھے اور ان کے لئے چلنا مشکل ہو رہا تھا۔

کچھ گروہ ایسے بھی تھے جو بالکل آزاد تھے اور محض اپنے شوق سے نشانہ بازی کے لئے نکلے تھے۔ اور انہوں نے اپنے لئے مختلف قسم کے مجاہدانہ نام رکھے ہوئے تھے مثلاً شکست کا بدلہ لینے والے یا مقبرے کے شہری یا موت سے کھیلنے والے یہ سب ڈاکوؤں کے گروہ کی طرح گزر رہے تھے۔ کپڑے، غلّے، چربی یا صابن کے بیوپاری ان کے لیڈر بنے ہوئے تھے۔ جنہیں حالات نے جنگجو بنا دیا تھا۔ اور جو اپنی ڈھالوں اور مونچھوں کی لمبائی کے سبب افسر منتخب کر لئے گئے تھے۔ انہوں نے اپنے جسموں کو ہتھیاروں اور ریشم کی خوشنما زینوں سے ڈھانپ رکھا تھا وہ پُر تکلف لہجے میں گفتگو کرتے تھے۔ اور مہم کی تجاویز پہ بحث کر رہے تھے۔ گویا دکھیا فرانس کو یہ شیخی خور اپنے کندھوں پہ اٹھائے ہوئے ہوں۔ بعض اوقات وہ اپنے ہی سپاہیوں سے خوفزدہ ہو جاتے تھے۔ کیونکہ یہ سپاہی سابقہ قیدی تھے جو شروع میں تو اکثر بہادری

دکھاتے تھے، مگر بعد میں لیٹرے اور عصمت ریزیوں کے مرتکب ثابت ہوتے تھے۔

خبر گرم تھی کہ جرمن رواں میں داخل ہونا چاہتے ہیں قومی محافظ دستے کے سپاہی جو دو مہینوں سے قریب کے جنگلوں میں دشمن کی نقل وحرکت کا جائزہ لے رہے اور جو بعض اوقات اپنے ہی سنتریوں کو گولی کا نشانہ بنا دیتے تھے اور جو جنگل میں کسی چھوٹے سے بھیڑیے کی حرکت کی آواز سن کر لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے اب اپنے گھروں میں واپس چلے آئے تھے۔ اُن کے ہتھیار، وردیاں اور دیگر سامانِ خون ریزی جس نے ہر طرف تین میل تک اپنے ہی ہموطنوں کے دلوں میں خوف طاری کر رکھا تھا یکایک غائب ہو گیا تھا

فرانس کے آخری سپاہی دریائے سین کے پاس آئے تاکہ سینٹ سیور اور بورگا شار سے ہوتے ہوئے اودمیر کے پل پہ پہنچ جائیں ان کے پیچھے ان کا جرنیل دو افسروں کے درمیان پیدل چل رہا تھا۔ وہ مایوس تھا۔ کیونکہ وہ اس شکستہ حال سپاہ کو کسی مہم کے لئے استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی بہادری کے باوجود اپنی خوگرِ فتح قوم کی شکست کے ہاتھوں تباہ ہو چکا تھا۔ شہر پہ خاموشی طاری تھی لوگ کسی متوقع خطرے کے پیشِ نظر خوفزدہ ہو رہے تھے۔ موٹے پیٹوں والے شہری جنہیں

تجارت نے مخنث بنا رکھا تھا فاتحین کا بڑی تشویش سے انتظار کر رہے تھے۔ وہ اس خیال سے کانپ رہے تھے کہ کہیں ان کی گوشت بھوننے کی سلاخیں اور کھانے کے چاقوؤں کو ہتھیار نہ تصور کر لیا جائے۔

زمند گھے کی گہما گہمی بھی ختم ہو چکی تھی۔ دکانیں بند پڑی تھیں بازار سنسان تھے۔ کبھی کبھی کوئی شہری خاموشی سے گھبرا کر دیواروں کے ساتھ ساتھ جلدی جلدی چلنے لگتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ دشمن جلد آجائے تاکہ انتظار کا خوف دور ہو۔ فرانسیسی افواج کی روانگی کے دوسرے دن سہ پہر کے وقت کچھ گھوڑ سوار نیزے تانے شہر میں آ پہنچے۔ پتہ نہیں یہ کہاں سے آدھمکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سینٹ کیتھرین کے پاس ایک ہجوم اترا۔ اور اس کے ساتھ ہی حملہ آوروں کے دو گروہ ڈارنیتال اور بوا گیلوم کے راستے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ تینوں گروہوں کے ہراول دستے بیک وقت ہوٹل دو ویل کے چوک میں ایک دوسرے کے ساتھ آملے۔ دوسرے بازاروں میں سے بھی جرمن افواج کا داخلہ شروع ہو گیا، ان کے دستے ہر طرف پھیل گئے، سڑکوں پر ان کے سخت قدموں کی چاپ اور کمانڈر کے کچھ احکام اجنبی زبان میں قبرستان نما ویران گھروں میں پہنچ گئے۔ لوگ بند کواڑوں کی اوٹ میں ان فتح مند انسانوں کو دیکھ رہے تھے۔ حقوق جنگ نے انہیں شہر، اس کی دولت اور اس کی

زندگیوں کا مالک بنا دیا تھا - اہل شہر اپنے کمروں میں بند پڑے تھے - ان پر وہ خوف و ہراس طاری تھا جو کسی حادثہ، عظیم یا جان لیوا زلزلے کے آنے کی صورت میں انسانوں پر طاری ہوتا ہے۔ اور جس کے مقابلے میں انسانی قوت بے کار ہو کر رہ جاتی ہے۔ جب نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اور جان و مال محفوظ نہیں رہتے، جب قانونِ انسانی اور قانونِ فطرت کے محافظ وحشت و بربریت اور عقل دشمنی کا شکار ہو جاتے ہیں تو لوگوں پر اسی طرح خوف چھا جاتا ہے۔ زلزلے سے مکانوں کا گرنا اور لوگوں کا ملبے کے نیچے دب جانا، دریا کی طغیانی کا کسانوں اور مویشیوں کی لاشوں اور جھونپڑوں کے شہتیروں کو بہا کر لے جانا، کسی فوجِ ظفر موج کا وطن کی حفاظت کرنے والوں کو تہِ تیغ کرنا، شہریوں کو قیدی بنا لینا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا اور گولے برسا کر خدا کا شکر بجا لانا سب ایک ہی طرح کے خوفناک مصائب ہیں۔ جب ایسے حادثات پیش آتے ہیں تو انسان عدلِ خداوندی کا منکر ہو جاتا ہے اُسے نہ خدا کی پناہ کا بھروسہ رہتا ہے اور نہ عقلِ انسانی کا اعتبار۔

کچھ دستوں نے ہر دروازے پر دستک دی اور پھر مکانوں میں غائب ہو گئے - وہ حملہ کر کے قابض ہو رہے تھے۔ اب مفتوحین کا فرض تھا کہ فاتحین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئیں وقت گزرنے

کے ساتھ ابتدائی خوف دور ہو جاتا ہے اور سکونِ تازہ میسر آتا ہے بہت سے گھرانوں میں جرمن فوجی گھر والوں کے ساتھ کھاتے تھے۔ ان میں سے بعض اچھے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ فرانس پر رحم کھاتے تھے۔ اور انہیں اس جنگ میں شرکت پر افسوس تھا۔ ایسے افسروں کے لوگ شکر گزار تھے کیونکہ وہ ان کی پناہ کے محتاج تھے۔ اگر آپ ایک افسر کو اچھی طرح سے رکھیں تو آپ کو کم لوگوں کو کھلانا پڑے گا۔ ہم جس کے کلی طور پر محتاج ہوں اُسے گزندکیوں پہنچائیں۔ ایسا کرنا شجاعت نہیں بلکہ تہور ہے۔ لیکن اہل روآں میں تہور کا نقص باقی نہیں رہا۔ جیسا کہ اس وقت تھا۔ جب اُنہوں نے دشمن کا دلیرانہ مقابلہ کر کے اپنے شہر کو شہرت بخشی تھی۔ اب ان میں سے ہر ایک کا یہی خیال تھا۔ کہ فرانسیسی تہذیب کا یہی تقاضا ہے کہ وہ اپنے گھر میں اجنبی سپاہی کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں۔ بشرطیکہ وہ علانیہ طور پر سب کے سامنے اس کے ساتھ راہ و رسم رکھنے کا اظہار نہ کریں۔ گھر سے باہر وہ ایک دوسرے کے متعلق لاعلمی کا اظہار کریں گے مگر گھر کے اندر وہ آزادانہ گپ لڑائیں گے اور جرمن بہت دیر تک ان کے ساتھ بیٹھا آگ تاپتا رہے گا۔

رفتہ رفتہ شہر اپنے معمول پر آگیا۔ فرانسیسی تو باہر نہ نکلتے تھے مگر جرمن بازاروں میں بڑبڑاتے پھرتے تھے۔ مختصر یہ کہ جرمن افسر جو مغرور کے

ساتھ اپنے ہتھیار لئے پھرتے تھے۔ اب اہل شہر کو نفرت آمیز تاسف کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے بالکل اُن افسروں اور کھلاڑیوں کی طرح جو ایک سال قبل انہیں قہوہ خانوں میں پینے کے لئے آتے تھے۔

اس کے باوجود فضا میں عجیب و غریب تکدّر تھا۔ ایک ناگوار سا ماحول تھا۔ جس میں حملے کی عفونت تھی۔ اندرون خانہ اور بیرونِ خانہ دونوں اس بُو سے پُر تھے۔ یہ بُو کھانے کے ذائقہ کو بدل دیتی تھی۔ اس کی موجودگی میں یہ احساس ہوتا تھا کہ اہل شہر وحشی اور خطرناک قبائل کے ساتھ اپنے وطن سے دُور سفر کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

فاتحین بہت زیادہ روپیہ وصول کرتے تھے۔ اہل شہر کو ہمیشہ دینا پڑتا تھا اور اُن کے پاس دینے کو کافی روپیہ تھا مگر ایک نارمن فرانسیسی تاجر جس قدر دولتمند ہوتا ہے اسی قدر اس کے لئے دوسرے کو دینا دشوار تر ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر سے دو تین میل کے فاصلے پر ملاحوں اور ماہی گیروں کو کسی نہ کسی جرمن فوجی کی پھولی ہوئی لاش مل جاتی تھی جسے چاقو یا پتھر سے قتل کیا گیا ہوتا تھا یا ویسے ہی پل پر سے دھکیل دیا گیا ہوتا غیر معروف منتقمین کا ہدف بننے والوں کی لاش دریا کی تہ کی دلدل میں دفن ہو جاتی تھی۔ اگرچہ یہ انتقام وحشیانہ تھا مگر مباح تھا۔ یہ چھپی ہوئی دلیری اور خفیہ حملے جنگوں سے زیادہ تباہ کن تھے اگرچہ ان کے ساتھ فتح کے

شاہ بانوں کی صدا شامل نہ تھی بیرونی حملہ آوروں سے نفرت کا جذبہ ہمیشہ بہادروں کو برانگیختہ کرتا ہے اور وہ لڑ مرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

جب حملہ آوروں نے بغیر کسی ارتکاب ظلم کے جس کا ان پر ان کے فتحمندانہ اقدام پر الزام لگایا جاتا تھا شہر کو پوری طرح سے رام کر لیا تو اہل شہر میں جرات کے آثار پیدا ہوئے اور تجارت کی خواہش نے کاروباری دنیا میں روح تازہ پھونک دی۔ بعضوں کے مفاد آور کے شہر کے ساتھ وابستہ تھے۔ یہ شہر ابھی فرانسیسی فوج کے قبضے میں تھا۔ اس لئے یہ لوگ بذریعہ خشکی اس بندرگاہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے جرمن شناساؤں کا اثر و رسوخ استعمال کیا اور آخر کار جرنیل انچیف سے اجازت روانگی حاصل کر لی۔

سفر کے لئے چار گھوڑوں والی بڑی سی گاڑی کرایہ پہ لی گئی اس گاڑی میں دس نشستیں تھیں۔ اور فیصلہ کیا گیا کہ منگل کو دن پھوٹنے سے پہلے ہی روانہ ہو جایا جائے تا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ پیر کے دن تین بجے تک کہر چھائی رہی اور شمال سے آنے والے سیاہ بادلوں سے برف گرنی شروع ہوئی اور رات بھر برف گرتی رہی۔ صبح کے ساڑھے چار بجے تمام مسافر نارمنڈی ہوٹل کے صحن میں جہاں سے انہیں گاڑی میں سوار ہونا تھا جمع ہوئے۔

ان پر ابھی تک نیند کا غلبہ تھا اور وہ لبادوں تلے بھی سردی سے کانپ رہے تھے۔ وہ مدھم روشنی میں بمشکل ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ اور وہ دبیز گرم کپڑے پہنے ہوئے گرجا کے بڑی توند والے قبا پوش پادری معلوم ہوتے تھے۔ آدمیوں میں سے صرف دو ایک دوسرے کے شناسا تھے تیسرا ان کے ساتھ جاملا تو وہ گفتگو کرنے لگے۔ ایک نے کہا "میں اپنی بیوی کو لینے جا رہا ہوں" دوسرے اور تیسرے نے بھی یہی کہا۔

پہلا بولا "ہم روآن واپس نہیں آئیں گے۔ اور اگر آور بھی جرمنوں کے قبضے میں آ گیا تو ہم انگلستان چلے جائیں گے۔ سب کے کچھ اسی قسم کے ارادے تھے۔ کیونکہ سب ایک ہی طرح کا ذہن رکھتے تھے۔

ابھی تک گھوڑے نہیں جُتے تھے۔ سائیس کا لڑکا چھوٹی سی لالٹین لئے ایک دروازے سے نکل کر دوسرے میں داخل ہوتا تھا۔ گھوڑوں کے زمین پر پاؤں مارنے کی آواز فرش پر پڑی ہوئی گھاس پھوس کی وجہ سے مدہم سنائی دیتی تھی۔ کسی آدمی کے گھوڑوں سے بولنے اور انہیں بُرا بھلا کہنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ گھنٹیوں کی ہلکی سی آواز سے پتہ چلتا تھا۔ کہ زین کو اتار اجار رہا ہے۔ یہ آواز جلد ہی جانوروں کے جسم کی حرکت کی وجہ سے ایک مسلسل آہنگ میں تبدیل ہو گئی۔ یہ ساز کبھی رُک جاتا اور کبھی زمین پر پاؤں کی ٹاپ کے ساتھ پھر شروع ہو جاتا تھا۔ اچانک دروازہ بند ہو گیا۔ شور ختم ہو گیا

سردی سے ٹھٹھرے ہوئے شہری خاموش اور بے حرکت تھے۔

مسلسل گرنے والی برف کی چادر زمین پر اترتی ہوئی چمک پیدا کرتی تھی۔ یہ تمام نقش مٹا دیتی تھی اور ہر چیز پر سفید غازہ بکھیر دیتی تھی۔ اس عظیم خاموشی میں کوئی صدا بلند نہ ہوتی تھی۔ شہر کچھ ایسے میں دبا ہوا اور پُرسکون تھا۔ یہ زمین کو ڈھانپ دینے والی برفباری آواز کی بجائے سنسنی سی پیدا کرتی تھی۔

لڑکا لالٹین لئے پھر نمودار ہوا وہ رسی میں بندھے ہوئے نارضامند گھوڑے کو کھینچ رہا تھا۔ اس نے اُسے بانس کے ساتھ رکھ کے باندھا اور دیر تک اس کی زین درست کرتا رہا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین تھی اس لئے اس کام کے لئے وہ صرف ایک ہاتھ ہی استعمال کر سکتا تھا۔ جب وہ دوسرا گھوڑا لینے گیا تو اس نے دیکھا۔ کہ مسافروں پر اتنی برف گری تھی کہ وہ بالکل سفید نظر آرہے تھے۔ اور بے حرکت کھڑے تھے۔ اس نے انہیں گاڑی میں بیٹھنے کا مشورہ دیا۔ تاکہ وہ برف سے بچ سکیں۔ انہیں اس کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ اور انہوں نے جلدی سے اس کے کہے پر عمل کیا۔ تین آدمیوں نے اپنی بیویوں کو پچھلی سیٹوں پر بٹھایا اور پھر خود بھی بیٹھ گئے۔ پھر باقی لوگ بھی بغیر کچھ کہے نشستوں پر بیٹھ گئے۔ فرش پر گھاس بچھی ہوئی تھی۔ جس میں پاؤں دھنس جاتے تھے۔ پچھلی نشستوں پر بیٹھی ہوئی خواتین اپنے ساتھ سٹوو لائی ہوئی تھیں۔ جنہیں روشن کیا گیا اور تین سٹوو کے فوائد

آہستہ آواز میں بیان کرنے لگیں وہی باتیں دہرانے لگیں جن کی عرصہ سے سب کو خبر تھی۔ گاڑی میں چار کی بجائے چھ گھوڑے جوتے گئے کیونکہ سفر خاصا خراب تھا۔ "کیا سب گاڑی میں بیٹھ گئے ہیں؟" کی آواز آئی اور گاڑی کے اندر سے کسی نے "ہاں" کہہ کر جواب دیا۔

وہ روانہ ہو گئے۔ کچھ مدت تک گاڑی آہستہ آہستہ چلتی رہی پہیے برف میں دھنسے ہوئے تھے۔ گاڑی کرڑ کرڑ کی صدا پیدا کر رہی تھی۔ گھوڑے برف میں چمک رہے تھے۔ ان کے منہ سے بھاپ نکل رہی تھی اور اُن کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ڈرائیور کا کوڑا مسلسل برس رہا تھا وہ سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا جب کسی گھوڑے کی پشت پر لگتا تھا تو وہ گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگتا تھا۔

دن نکل آیا تھا۔ برف کی ہلکی پھانکیں جو بقول ایک مسافر کے جو روآں میں پیدا ہوا تھا، روئی کے گالوں کی طرح تھیں گرنی بند ہو چکی تھیں۔ گہرے بادلوں میں سے ہلکی سی روشنی چھن کر آ رہی تھی جو سفید کھیتوں کو چمکا رہی تھی۔ ان کھیتوں میں درخت برف سے ڈھکے پڑے تھے اور چمنی نے بھی برف کی کلاہ پہن رکھی تھی۔ صبح کی اس اداس روشنی میں گاڑی کے مسافروں نے ایک دوسرے کو متجسس ہو کر دیکھا۔

پچھلی بہترین نشستوں پر شراب کا تھوک کا بیوپاری موسیو لوآزو

اور اس کی بیوی ایک دوسرے کے مقابل سو رہے تھے۔ موسیو لوازو نے اپنے سابق مالک کی دکان خرید لی تھی اور اس کی دولت کو اپنا لیا تھا۔ وہ خراب شراب اچھی قیمت پر پرچون فروشوں کے پاس بیچتا تھا۔ اور اپنے دوستوں اور شناساؤں میں عیار مسخرہ سمجھا جاتا تھا، وہ صحیح معنوں میں نارمن فرانسیسی یعنی زندہ دلی اور دھوکہ بازی کا جیتا جاگتا پیکر تھا۔

بحیثیت ایک پتے باز کے وہ بڑی شہرت رکھتا تھا۔ جس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک شام موسیو ترنل نامی افسر کے ہاں جو کہانیوں اور گانوں کا مصنف تھا ایک معزز شہری نے چند خواتین کو مائل بخواب دیکھ کر یہ مشورہ دیا کہ وہ بازی جیتنے کے لئے لوازو کی پتے بازی کے گر استعمال کریں۔ یہ مذاق اس قدر مقبول ہوا کہ افسر کے کمرے سے نکل کر پورے شہر میں پھیل گیا اور مہینوں تک پورے صوبے میں لوگ اس کو سن کر ہنستے تھے۔ لوازو تمسخر کے لئے مشہور تھا۔ وہ اچھا برا سب طرح کا مذاق کرتا تھا۔ اور اس کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے آدمی کو اس کی قدر و قیمت کا خیال رہتا تھا، وہ لمبا اور غبارے کی طرح گول مٹول تھا اور اس کے سرخ چہرے پر سفید مونچھیں دائرہ بنا رہی تھیں۔

اس کی بیوی گھر انڈیل، مضبوط اور مستقل مزاج تھی۔ اس کے اطوار سے اس کی قوت فیصلہ کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ اپنی ان خوبیوں کی

وجہ سے کاروبار کا نظم و نسق اور حساب کتاب درست رکھتی تھی، اور وہ اپنی زندہ دلی کی بدولت کاروبار میں زندگی پیدا کرتا تھا۔

اس کے قریب ہی موسیو کاشے لامادوں بڑے وقار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا گویا وہ اعلیٰ ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ روئی کا بڑا تاجر تھا جس کی تین ملیں تھیں اور حجہ خطاب یافتہ ہونے کے علاوہ جنرل کونسل کا رکن بھی تھا۔ وہ شہنشاہیت کے عہد میں حزب مخالف کا قائد رہ چکا تھا۔ بقول خود اس کے اس نے شہنشاہ کو تجویز کی حمایت پر آمادہ کر کے اسے اس سے کہیں زیادہ نقصان پہنچایا تھا جو اُسے مخالفت کرنے کی صورت میں پہنچ سکتا تھا۔ مادام کاشے لامادوں اپنے خاوند کے مقابلے میں بہت کم عمر تھی۔ اچھے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے فوجی افسر جب روآن کے شہر میں بھیجے جاتے تھے تو وہاں یہی ان کی دلچسپی کا مرکز ہوتی تھی، یہ خوبصورت اور نفاست پسند عورت جو قیمتی کھالوں کا لبوس پہنے اپنے خاوند کے بالمقابل بیٹھی بڑی حسرت سے گاڑی کے اندر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

مادام کاشے لامادوں کے ساتھ ہی اد بیغ دو بریویل کا نواب اور اس کی بیگم بیٹھے ہوئے تھے جو نارمنڈی کے قدیم ترین خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نواب اچھی خاصی شکل وشباہت کا عمر رسیدہ آدمی تھا

وہ سامانِ زینت کی کرشمہ سازیوں کا سہارا لے کر شہنشاہ ہنری چہارم کے ساتھ اپنی مشابہت کو نمایاں کرتا تھا۔ نواب کے گھرانے کی ایک شاندار روایت کے مطابق ہنری چہارم نے اس گھرانے کی ایک خاتون کو حاملہ کر دیا تھا چنانچہ اس کی تلافی کرنے کے لیئے اس خاتون کے خاوند کو نواب اور صوبے کا گورنر بنا دیا گیا۔

وہ جنرل کونسل میں موسیو کاغنے لامادوں کا رفیق کار تھا۔ اور اس محکمہ میں اورلیاں پارٹی کا نمائندہ تھا۔ اس نے جہاز کے معمولی کپتان کی لڑکی سے شادی کی تھی اور یہ بات لوگوں کے لیئے ابھی تک معمہ ہی تھی۔ لیکن چونکہ وہ بڑی شان و شوکت سے رہتی تھی اور لوگوں کا بہترین استقبال کرتی تھی۔ اور اس کے متعلق یہ بھی کہا جاتا تھا کہ شاہ لوئی فلپ کا لڑکا اس کی محبت میں اسیر رہ چکا تھا۔ اس لئے تمام شرفاء اور رؤساء اس کا احترام کرتے تھے اس لیۓ اس کی نشست گاہ ملک بھر میں اوّل درجہ کی سمجھی جاتی تھی جہاں قدیم عشق باز جمع ہوتے تھے اور اس بزم تک رسائی حاصل کرنا بہت دشوار تھا۔ اس خاندان کی آمدنی پانچ لاکھ فرانک تھی۔

یہ چھ افراد گاڑی میں بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔ جو سنجیدہ مضبوط، دیانتدار اور مستحکم تھے۔ جن کے پاس مذہب بھی تھا، اور اصول بھی۔

اتفاق کی بات ہے کہ تمام عورتیں ایک ہی طرف بیٹھی ہوئی تھیں نواب کی بیگم کے ساتھ دو راہبائیں بیٹھی ہوتی تھی جو تسبیح لئے ورد کر رہی تھیں۔ ایک عمر رسیدہ تھی اور اس کا منہ چیچک کے داغوں سے پُر تھا۔ دوسری کا چہرہ پیارا تھا مگر پھیپھڑوں میں نقص تھا۔ یہ دو وجودان کے اعتقاد کو قوی تر کرتی تھیں۔ اور انہیں روشنی بخش کر شہدا کی ہم شکل بناتی تھیں۔

ان دو کے مقابل ایک مرد اور ایک عورت بیٹھے ہوئے تھے جو سب کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ مرد مشہور و معروف جمہوریت پسند کورنودے تھا جس سے شرفاء خائف تھے بیس برس تک وہ عوام کے قہوہ خانوں میں بیٹھ کر اپنی طویل و سُرخ داڑھی کو شراب سے سیراب کرتا رہا تھا۔ اس نے اپنے باپ سے ورثہ میں پائی ہوئی دولت، اپنے دوستوں اور پارٹی کے ممبروں کے ساتھ مل کر صرف کر ڈالی تھی۔ وہ ایک پرانے مٹھائی فروش کا بیٹا تھا۔ وہ اب جمہوریت کی بحالی کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہا تھا تاکہ اُسے وہ مرتبہ حاصل ہو جائے۔ جس کا وہ ان اخراجات کی وجہ سے مستحق تھا۔ چار ستمبر کو ایک مذاق کے نتیجہ کے طور پر اس نے یہ خیال کر لیا کہ اُسے افسر منتخب کر لیا گیا ہے۔ جب وہ دفتر میں اپنے فرائض انجام دینے کے لئے گیا تو وہاں کلرکوں کا تسلط تھا جنہوں نے اسے افسر تسلیم کرنے

سے انکار کردیا اور واپس جانے پر مجبور کیا۔ وہ ایک نیک کنوارہ تھا۔ جو بے ضرر اور کارآمد تھا۔ اس نے بڑے خلوص سے ملک کے دفاع میں حصّہ لیا تھا۔ اس نے میدانوں میں گڑھے کھودے، درخت کاٹے سڑکوں پر جال پھیلائے اور دشمن کی آمد پر جلدی سے بھاگ کر شہر میں واپس آگیا۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ آور جاکر زیادہ مفید ثابت ہو سکے گا۔ کیونکہ وہاں پر خندقیں کھودنا ضروری ہوگا۔

عورت عشوہ طراز تھی اور اپنے مٹاپے کی وجہ سے مشہور تھی لوگ اسے چربی کا گولا کہتے تھے۔ وہ پست قد، گول مٹول اور موٹی تھی اس کی نرم و گداز انگلیاں سور کے گوشت کے ٹکڑوں کا گچھا معلوم ہوتی تھیں اس کے رنگ میں چمک تھی اور اس کی بڑی بڑی چھاتیاں تھرتھرا رہی تھیں مگر اس کی تازگی اور چستی کی وجہ سے لوگ اس کی جستجو کرتے تھے۔ اس کا چہرہ گول سیب کی طرح تھا یا ایک کلی کی طرح جو کھل کر پھول بننا چاہتی ہو آنکھیں سیاہ تھیں اور ابرو گھنے تھے۔ اس کے دلفریب منہ میں بوسہ لینے والے کے لئے، طراوت موجود تھی اور دانت بچوں کے سے تھے۔ وہ قابل تعریف خوبیوں سے پُر سمجھی جاتی تھی۔

جب اُسے پہچان لیا گیا تو دیانتدار عورتوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں، لفظ "طائفہ" اور "ننگ خاص و عام" کے الفاظ کچھ اس

پر زور لہجے میں ۔ گئے کہ وہ سر اٹھا کر دیکھنے لگی - اس نے اپنے قریب بیٹھی ہوئی - عورت کو اس شدت سے گھورا کہ ہر طرف خاموشی طاری ہو گئی سوائے لوازو کے ہر ایک نے نظریں جھکا لیں - لوازو اُسے بہ نظرِ تحسین دیکھ رہا تھا ۔

تینوں عورتوں کے درمیان فوراً ہی گفتگو شروع ہو گئی - اس لڑکی کی موجودگی نے ان میں دوستی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا اور وہ ایک دوسرے سے گھل مل گئی تھیں - انھوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ان کی شادی شدہ عزت، کو اس آبرو کے خلاف متحد ہونا چاہیے جو بغیر شرم و حیا کے فروخت ہوتی ہے - کیونکہ قانونی محبت آزاد محبت کو نفرت سے دیکھتی ہے ۔

کارنودے کو دیکھکر تینوں مرد تحفظ ذات کے جذبہ کے زیر اثر ایک دوسرے کے قریب ہو کر دولت کے متعلق ایسے لہجے میں گفتگو کر رہے تھے جس سے غریبوں سے نفرت کا اظہار ہوتا تھا ۔ نواب اُبیغ جرمنوں کی مچائی ہوئی تباہی، فصلوں اور مویشیوں کے نقصانات کا ذکر اس لارڈ کی طرح کر رہا تھا جو اس سے دس گنا دولتمند ہو اور جس پر ان تباہ کاریوں کا خفیف سا اثر ہو - موسیو کا غنے لامادوں جو روئی کی صنعت کا وسیع تجربہ رکھتا تھا چھ لاکھ فرانک کی معمولی رقم انگلستان خفظِ ماتقدم کے طور پر بھیجنا چاہتا تھا - لوازو نے اپنی مقام شراب فرانسیسی حکومت

کے پاس فروخت کر دی تھی جس کے لئے حکومت اس کی مقروض تھی اور اُسے اُمید تھی کہ قرضہ کی رقم اُسے شہر آور میں وصول ہو جائیگی۔

تینوں ایک دوسرے پر تیزی سے دوستانہ نگاہ ڈالتے تھے اگرچہ اُن کے حالات مختلف تھے مگر دولت کی بنا پر وہ ایک دوسرے کو بھائی سمجھے تھے۔ یہ ان لوگوں کی عظیم برادری ہے جن کے پاس دولت ہے۔ اور جن کی جیبوں میں سونے کی ڈلیاں کھڑکھڑاہٹ پیدا کرتی ہیں

گاڑی اس قدر آہستہ چل رہی تھی کہ وہ دس بجے تک چار میل سے زیادہ فاصلہ طے نہ کر سکے تھے۔ مردوں کو تین دفعہ پیدل پہاڑوں پر چڑھنے کے لئے گاڑی سے اترنا پڑا تھا۔ وہ پریشان سے تھے کیونکہ اب تک انہیں ٹوٹ کے مقام پر پہنچ کر ناشتہ کر لینا چاہیئے تھے۔ اور اب انہیں رات سے پہلے وہاں پہنچنے کی اُمید نہ تھی۔ ہر ایک راستے میں سرائے ڈھونڈتا جاتا تھا۔ گاڑی برف میں پھنس گئی اور اسے نکلتے نکلتے دو گھنٹے لگ گئے۔

بھوک سے دماغ ماؤف ہو رہے تھے اور کوئی طعام گاہ یا شرابخانہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جرمنوں کی آمد نے ان دکانداروں کو بھگا دیا تھا۔ مسافر شرفا خوراک کی تلاش میں کھیتوں کی طرف بھاگ کر گئے مگر انہیں وہاں روٹی تک میسر نہ آئی کسانوں نے فوجیوں کی لوٹ کھسوٹ کے ڈر سے اپنے ذخیرے

چھپا رکھے تھے کیونکہ بھوکے سپاہی کھانے کی اشیاء پر جبراً قبضہ کر لیتے تھے
دوپہر کے ایک بجے موسیو لوازو نے اعلان کیا کہ بھوک کی وجہ سے اس کے پیٹ
میں گڑھا پڑ گیا ہے ..... اس کا ہر ساتھی مصیبت میں مبتلا تھا اور بڑھتی ہوئی
بھوک نے گفتگو کا خاتمہ کر دیا تھا۔ وقتاً فوقتاً کوئی نہ کوئی جماہی لینے لگتا تو
دوسرے بھی یہی کرتے۔ ہر ایک باری باری اپنی شخصیت، زندگی کے متعلق
واقفیت، اور اپنی سماجی حیثیت کے مطابق احتیاط یا عدم احتیاط سے منہ
کھولتا، اور جلدی سے اپنا ہاتھ منہ کے سوراخ کے آگے رکھ لیتا جہاں سے بھاپ
نکلتی تھی۔

"چربی کا گولا" نامی عورت، کافی تردّد کے بعد اپنی قمیض کے نیچے
کچھ تلاش کرنے کے لئے جھکی۔ اس نے لمحہ بھر کے لئے متامّل ہو کر اپنے ہمسایوں
کی طرف دیکھا اور پھر بڑے سکون کے ساتھ بیٹھ گئی۔ مسافروں کے چہرے
زرد اور اترے ہوئے تھے۔ موسیو لوازو نے کہا کہ وہ تھوڑے سے گوشت
کے عوض ایک ہزار فرانک دینے کو تیار ہے۔ اس کی بیوی نے اشارے سے
احتجاج کیا مگر خاموش رہی۔ دولت ضائع کرنے کی بات سن کر اُسے سخت
تکلیف ہوتی تھی۔ اس موضوع پر وہ کسی مذاق کی بھی داد نہیں دے
سکتی تھی۔ نواب نے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے سفر کے لئے کھانا
لانے کا کیوں خیال نہ آیا۔ ہر ایک اسی طرح خود کو ملامت کرتا تھا۔

کارنودے کرم نامی شراب کی صراحی بھر لایا تھا۔ مگر اس کی شراب کی پیشکش کو ٹھکرا دیا گیا۔ صرف لوازو نے دو گھونٹ پیئے اور پھر شکریہ ادا کر کے صراحی یہ کہکر واپس کر دی "بہرحال یہ اچھی چیز ہے۔ یہ گرمی بھی پہنچاتی ہے۔ اور بھوک کو کم بھی کرتی ہے" شراب نے اس کی طبیعت کو بشاش کر دیا چنانچہ اس نے کہا انہیں وہی کرنا چاہیے جو اس جہاز والوں نے کیا تھا جس کا گیت میں ذکر ہے یعنی مسافروں میں سے سب سے موٹے کو کھا جانا چاہیئے۔ چربی کے گولے کی طرف یہ اشارہ سُن کر خاندانی لوگ تو خاموش رہے۔ صرف کارنودے اس مذاق پر ہنسا دو راہباؤں نے تسبیح گردانی چھوڑ کر اپنی بڑی بڑی آستینوں میں دونوں ہاتھ باندھے بالکل ساکت ہو گئیں اور اپنی نگاہیں جبراً نیچے کر لیں گویا وہ آسمان کی لائی ہوئی مصیبت ہی کو پیش کر رہی تھیں۔

آخر کار تین بجے جب وہ ایک لامتناہی میدان میں سے گزر رہے تھے۔ جہاں کسی گاؤں کا نام و نشان تک نہ تھا چربی کے گولے نے جھک کر اپنی نشست کے نیچے سے سفید رومال سے ڈھکی ہوئی ایک بڑی سی ٹوکری نکالی پہلے اس نے چھوٹی سی طشتری اور چاندی کی پیالی نکالی۔ پھر اس نے ایک بڑی طشتری نکالی جس میں دو سالم چوزے تھے۔ ٹوکری میں اور بھی کھانے کی اچھی اچھی چیزیں تھیں، سموسے، پھل اور مٹھائیاں وغیرہ

یہ سب خوراک راستے میں سرائے نہ ملنے کی صورت میں تین دن کے لئے کافی تھی۔ چار بوتلیں بھی سامان میں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے ایک چوزے کا بازو لیکر ایک بسکٹ کے ساتھ ملا کر بڑی نفاست، سے کھانا شروع کیا۔ اِس بسکٹ کو نارمنڈی میں "ریجنس" کہتے ہیں۔

سب کی نظریں اس کی طرف پھر گئیں۔ کھانے کی خوشبو پھیلی تو لوگوں کے نتھنے پھیلے اور منہ میں پانی بھر آیا اور ساتھ ہی ان کے جبڑوں میں کانوں کے پیچھے ہلکا سا درد بھی محسوس ہوا۔ اس لڑکی سے خواتین کی نفرت انتہائی شدت اختیار کر گئی۔ ان کے دلوں میں اسے قتل کر کے اِسے اِس کے چاندی کے پیالے، اس کی ٹوکری اور اس کے سارے سامان کو گاڑی سے باہر برف میں پھینک دینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ مگر لوازو نے اپنی آنکھوں سے اس کے چوزے پر گاڑی ہوئی تھیں۔ اس نے کہا "خوش قسمتی سے مادام ہم سے زیادہ محتاط ہیں۔ ابھی کچھ ایسے لوگ ہیں جو مستقبل کے متعلق خیال کر سکتے ہیں"

اس نے اس کی طرف رُخ پھیرتے ہوئے کہا "شوق فرمائیے جناب! اتنی دیر تک بغیر ناشتے کے گزر کرنا بہت مشکل ہے"

لوازو نے اُسے سلام کرتے ہوئے جواب دیا "بخدا تکلف برطرف میں اس پیشکش کو رد نہیں کر سکتا۔ میں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ جنگ

میں سب کچھ درست ہے - کیا خیال ہے مادام ؟" پھر سب پر سیر حاصل نگاہ ڈال کر مزید کہا۔" ایسے لمحات میں کام آنے والے لوگوں کو پاکر انتہائی مسرت ہوتی ہے"

اس نے اپنا اخبار اپنے زانوؤں پر رکھ لیا تاکہ اس کی پتلون پر دھبے نہ پڑیں - پھر اس نے اپنا جیبی چاقو نکال کر اس کی نوک سے جیلی میں لپٹی ہوئی چوزے کی ٹانگ... اٹھالی - اس نے اسے اس اطمینان سے چبانا شروع کیا کہ گاڑی میں ہر طرف آہیں بلند ہونے لگیں۔

چربی کے گولے نے دو راہباؤں کو اپنے اس مختصر کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دی - دونوں نے فوراً یہ دعوت قبول کر لی اور ہکلاتے ہوئے شکریہ ادا کر کے آنکھیں جھکا کر تیزی سے کھانا شروع کر دیا - کارلو دے بھی اپنے ہمسایہ کی دعوت کا انکار نہ کر سکا تھا - چنانچہ ان چاروں نے اخبار پھیلا کر مل کر کھانا شروع کر دیا -

منہ تیزی کے کھلتے اور بند ہوتے تھے ، وہ چباتے ، نگلتے اور بے صبری سے پی رہے تھے - لوازو اپنے کونے میں بیٹھا بڑی محنت سے کھا رہا تھا اور آہستہ سے اپنی بیوی کو اپنے نقشِ قدم پہ چلنے کی ترغیب دے رہا تھا - وہ دیر تک انکار کرتی رہی - مگر جب اشتہا حد سے بڑھ گئی تو اس نے ہتھیار ڈال دیئے -

اس نے "چربی کے گولے" کو حسین ساتھی کہکر مخاطب کرتے ہوئے پوچھا

"کیا میں ایک ٹکڑا مادام لوازو کو بھی پیش کر سکتا ہوں؟"

اس نے اپنی طشتری آگے بڑھاتے ہوئے جواب "کیوں نہیں جناب ضرور پیش کیجئے۔"

جب شراب کی پہلی بوتل کھولی گئی تو انہیں گھبراہٹ سے دوچار ہونا پڑا۔ کیونکہ ان کے پاس صرف ایک ہی پیالہ تھا۔ ہر ایک چکھنے کے بعد اسے آگے بڑھا دیتا تھا۔ کارنودے واحد شخص تھا جس نے شائستگی ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی حسین ہمسایہ کے لبوں کے لمس سے گیلی ہوئی جگہ پر اپنے لب رکھے۔ نواب اور بیگم دوبریویل اور موسیو اور مادام کاغے لاماڈوں کھانے والوں میں گھر گئے اور کھانے کی بُو سے اُن کا دم گھٹنے لگا تو انہیں انتہائی کوفت ہوئی روئی کے سوداگر کی نوجوان بیوی نے اس زور سے آہ کھینچی کہ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ برف کی طرح سفید ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور سر ڈھلک گیا وہ بیہوش ہو چکی تھی۔ اس کے خاوند نے گھبرا کر ہر ایک سے مدد کی درخواست کی کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ آخر کار عمر رسیدہ راہبہ نے مریضہ کے سر کو تھام کر "چربی کے گولے" کا پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا اور اُسے شراب کے چند قطرے نگلنے پر مجبور کیا۔ خوبصورت خاتون صحت یاب ہو گئی اور آنکھیں کھول کر مسکراتے ہوئے نحیف آواز میں کہا کہ اب میں ٹھیک ٹھاک ہوں مگر عمر رسیدہ راہبہ نے یہ سوچا کہ کہیں دوبارہ دورہ نہ پڑ جائے۔ اُسے پورا گلاس

پینے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا "یہ سب کچھ محض بھوک کی وجہ سے ہے"

اس پر" چربی کے گولے" نے شرم اور گھبراہٹ سے چار بھوکے مسافروں کی طرف دیکھکر کہا" خدا بہتر جانتا ہے کہ مجھے ان معزز حضرات و خواتین کی خدمت میں کچھ پیش کرنے کی جسارت کرنی چاہیے یا نہیں" یہ کہکر وہ خاموش ہوگئی مگر لوازو نے اس کی اس بات کو غنیمت جان کر کہا" ہاں کیوں نہیں؟ ایسے موقع پر سب انسان بھائیوں کی طرح ہوتے ہیں اور انہیں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیئے - محترم خواتین - تکلف چھوڑیئے اس دعوت کو قبول نہ کرنے کی کونسی بات ہے - ہمیں یہ بھی خبر نہیں - کہ ہمیں رات گذارنے کے لئے کوئی مکان بھی ملے گا یا نہیں - جس رفتار سے ہم جارہے ہیں ہم کل دوپہر سے پہلے ٹوٹ کے مقام تک نہیں پہنچ سکتے -"

وہ ابھی تک ہچکچا رہے تھے اور کسی میں" ہاں" کہنے کی جرأت نہ تھی نواب نے ہاں کہنے کا فیصلہ کر لیا - اس نے موٹی اور مرعوب لڑکی کی طرف رخ پھیرتے ہوئے تواضع کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

" مادام! ہم شکریہ کے ساتھ یہ دعوت قبول کرتے ہیں"

پہلا اقدام بہت اہمیت رکھتا ہے - رکاوٹ دور ہو جائے تو آدمی موقع سے فائدہ اٹھا لیتا ہے - ٹوکری بند تھی - مگر اس میں کچھ سمو سے بھنی ہوئی زبان، کچھ ناشپاتیاں - روٹی - کچھ قتلے، اچار اور پیازوں سے بھرا ہوا پیالہ

اور کچھ اسی قسم کی چیزیں تھیں جو "چربی کے گولے" کو تمام عورتوں کی طرح بے حد پسند تھیں۔

وہ اس لڑکی کا زادِ راہ اس سے گفتگو کئے بغیر نہیں کھا سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ابتداء میں اس سے تکلف کی باتیں کی اور جب اس نے عمدگی سے ان کی باتوں کا جواب دیا تو وہ اُس سے زیادہ کھُل گئیں۔ بیگم وو بریول اور مادام کارنے لاما دون جو اعلیٰ تربیت سے جزوی اور کلی طور پر واقف تھیں بڑی نفاست سے اظہار محبت کرتی تھیں۔

نواب کی بیگم خاص طور پر ان اعلیٰ خواتین کی سی قابلِ محبت تواضع کا اظہار کرتی تھیں۔ جنہیں کسی قسم کا رابطہ ان کے مقام سے نیچے نہیں گراتا، اور اپنے اس انداز کی وجہ سے وہ مسحور کن تھیں۔ مگر مادام لوازو جس کی فطرت میں قناعت تھی بیہودہ کی بیہودہ ہی رہی۔ وہ کھاتی زیادہ تھی۔ اور بولتی کم تھی۔

لامحالہ طور پر موضوعِ گفتگو جنگ تھا۔ وہ جرمنوں کے مہیب افعال اور فرانسیسیوں کی بہادری کا تذکرہ کر رہے تھے۔ وہ سب کے سب اگرچہ خود بھاگ رہے تھے۔ مگر پیچھے رہنے والوں کو خراجِ تحسین دے رہے تھے۔ اس کے بعد آپ بیتیاں سنائی جانے لگیں۔ "چربی کے گولے" نے صحیح جذبے کے ساتھ ان پر جوش الفاظ میں جو ایسی لڑکیاں اپنے فطری

جذبات کے اظہار کے لئے بعض اوقات استعمال کرتی ہیں۔ اپنے روآن سے نکلنے کی داستان سنائی۔ اس نے کہا: "شروع میں مَیں سمجھتی تھی کہ میں شہر روآن میں رہ سکتی ہوں۔ میرا گھر کھانے پینے کی اشیا سے پُر تھا۔ اور میں چند سپاہیوں کی پرورش کو بغیر کسی منزلِ مقصود کے شہر چھوڑنے پر ترجیح دیتی تھی۔ لیکن جب میں نے ان جرمنوں کو دیکھا تو میں بے قابو ہو گئی انہیں دیکھ کر غصے سے میرا خون کھولنے لگتا تھا۔ اور میں سارا دن فرطِ شرم سے روتی رہتی تھی۔ کاش میں مرد ہوتی!

میں ان نوکیلی خودیں پہنے ہوئے سوروں کو اپنی کھڑکی میں سے دیکھتی تھی۔ جب میں گھر کا فرنیچر اٹھا کر ان کے سروں پر پھینکنے لگتی تو میری خادمہ میرا ہاتھ پکڑ لیتی۔ ایک دن تو ایک جرمن سپاہی میرے گھر ہی رہنے کے لئے آ گیا۔ میں نے اس کا گلا دبوچ لیا ان کو گلا گھونٹ کر مار دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ اگر دوسرے مجھے بالوں سے پکڑ کر علیحدہ نہ کرتے تو میں وہیں اس کا کام تمام کر دیتی اس کے بعد میرے لئے ان کی نظروں سے دور رہنا ضروری ہو گیا۔ آخر کار جب موقع ملا میں نے شہر کو خیرباد کہا اور اب میں آپ کے سامنے ہوں۔"

انہوں نے اُسے مبارکباد دی۔ اور اس کے ساتھی جو اس تیز مزاجی کا مظاہرہ نہ کر سکے تھے۔ اس کی قدر و منزلت کرنے لگے۔ کارنودے نے اس کی داستان سنتے وقت پیغمبر کا سا مشفقانہ اور پسندیدگی آمیز تبسم کیا۔

وہ یوں مسکرایا جیسے ایک پادری کسی عبادت گزار کو خدا کی حمد کرتے دیکھ کر مسکراتا ہے۔ کیونکہ لمبی داڑھی والے جمہوریت نواز حب الوطنی کے ٹھیکیدار ہوتے ہیں۔ جیسے کہ جبّہ پہننے والے لوگ مذہب کے ٹھیکیدار ہوتے ہیں۔ جب اس کے بولنے کی باری آئی تو وہ واعظانہ انداز میں بولا اور اس زور و شور سے اعلانات کئے جس طرح سے کہ شہر کی دیواروں پر چسپاں اشتہارات میں کئے جاتے ہیں اور آخر میں اس نے اپنی فصاحت نپولین کو لتاڑنے میں صرف کی۔ اس پر "چربی کا گولہ" برہم ہو گئی کیونکہ وہ نپولین کے طرفداروں میں سے تھی۔ اس نے غصّہ سے لال پیلا ہو کر کہا۔ "میں چاہتی ہوں کہ اس کی جگہ تم ہوتے —— تم جیسے دوسرے لوگ۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔ تم ہی لوگوں نے اس کے ساتھ غداری کی۔ اگر فرانس پر تمہارے جیسے بدمعاش حکمران ہوتے تو کسی کو بھی فرانس کو چھوڑنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔"

کارنودے پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا اور بدستور احساسِ برتری کے ساتھ مسکراتا رہا۔ لیکن سب نے محسوس کر لیا کہ بات بہت بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ نواب نے بدقت ناراض لڑکی کو خاموش کرایا اور تحکمانہ انداز میں کہا کہ تمام مخلص افراد کا احترام کرنا چاہیئے۔ لیکن نواب اور صنعتکار کی بیگمات کے دلوں میں جمہوریت پسند لوگوں کے خلاف نامعقول نفرت کا جذبہ تھا اور وہ عام عورتوں کی طرح آمریت اور اس کی شان و شوکت کو پسند کرتی تھیں اس لئے انہوں نے محسوس کیا کہ وہ

اپنی تمکنت اور وقار کے باوجود اس طائفہ کی طرف کھینچی چلی جاتی تھیں۔ جس کے جذبات اُن کے جذبات سے بے حد ہم آہنگ تھے۔

ٹوکری خالی ہو چکی تھی۔ دس بجے تک تمام اشیاء کھائی جا چکی تھیں۔ اور چیزوں کے ختم ہو جانے پر سب کو افسوس تھا۔ گفتگو کچھ عرصہ جاری رہی۔ مگر چونکہ کھانے کو کچھ نہ تھا اس لئے کلام میں گرمی ختم ہو گئی رات نے آ لیا۔ تاریکی رفتہ رفتہ گھمبیر ہو گئی اور "چربی کا گولہ" اپنے مٹاپے کے باوجود سردی سے کانپنے لگی۔ نواب کی بیگم نے اپنا چھوٹا سا آتشدان جسے صبح سے کئی دفعہ گرم کیا گیا تھا۔ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے اس پیشکش کو فوراً قبول کیا۔ کیونکہ سردی سے اس کے پاؤں سن ہو رہے تھے۔ بیگم کاغنے لاماڈوں اور بیگم لوازو نے اپنے آتشدان دو راہباؤں کو دیئے۔

ڈرائیور نے اپنی شمعیں جلا رکھی تھیں۔ وہ بڑی اچھی روشنی دے رہی تھیں۔ گھوڑوں کے پسینے کے گرد پیش جھاگ کا بادل سا دکھائی دیتا تھا اور چلتی ہوئی روشنی کے نیچے راستے پر پڑی ہوئی برف طے ہوتی معلوم ہوتی تھی۔

گاڑی کے اندر اندھیرے میں اشیا کا امتیاز نہیں ہو سکتا تھا لیکن کارنودے اور "چربی کے گولے" کے درمیان اچانک ایک حرکت معلوم ہوتی۔ اور لوازو جس کی نگاہ تاریکی کو چیر گئی تھی سمجھتا تھا کہ اس نے داڑھی والے آدمی کو تیزی سے نیچے ہٹتے دیکھا ہے گویا اُسے ایک تیز اور بے آواز مُکّا رسید کیا گیا

تھا۔

دُور۔ سے سڑک، کے ساتھ ساتھ ٹمٹماتی ہوئی روشنی نظر آئی۔ شہر ٹوٹ قریب آگیا تھا۔ انہوں نے گیارہ گھنٹے سفر کیا تھا۔ دو گھنٹے راستے میں ٹھہر کر آرام کرنے اور گھوڑوں کو چارہ کھلانے میں لگے اس طرح سے کل تیرہ گھنٹے صرف ہوئے۔ وہ شہر میں ہوٹل آف کامرس کے سامنے رُک گئے۔

گاڑی کا دروازہ کھلا۔ ایک آواز نے مسافروں کو چونکا دیا۔

یہ تلوار کی نیام سے زمین پر ضرب لگانے کی آواز تھی۔ یکایک تاریکی میں جرمن فوجی کی آواز سنائی دی گئی۔

اگرچہ گاڑی چل نہیں رہی مگر پھر بھی کوئی نیچے نہ اُترا۔ سب کو یہی خوف تھا۔ کہ کوئی اس گھات میں نہ ہو کہ انہیں باہر نکلتے ہی موت کے گھاٹ اتار دے۔ تھوڑی دیر میں کنڈیکٹر شمع لئے آیا۔ روشنی میں خوفزدہ چہروں کی دو قطاریں نظر آرہی تھیں ان کے منہ کھلے ہوئے تھے اور آنکھوں سے خوف و ہراس نمایاں تھا۔

گاڑی کے باہر ڈرائیور کے پاس ایک جرمن افسر کھڑا تھا جو طویل قامت دبلا پتلا اور سُرخ چہرے اور بالوں والا تھا۔ اس کی وردی لڑکیوں کی کورسیٹ کی طرح تنگ تھی اور سر پر انگلستان کے ہوٹل کے چوکیدار کی طرح ہیٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں جن میں لمبے لمبے بال تھے اس کے چہرے

کی دونوں جانب بڑھتی ہوئی بالتدریج پتلی ہوتی جاتی تھیں اور آخر ایک سُرخ دھاگے کی صورت اختیار کر لیتی تھیں اور یہ سُرخ دھاگہ اتنا باریک ہوتا تھا کہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ کہاں جا کر ختم ہوتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان مونچھوں نے اس کے منہ کے گوشے پر خاصہ بوجھ ڈال رکھا ہے۔ یہ مونچھیں اس کے رخسارو‌ں سے نیچے جھک کر اس کے ہونٹوں کے ارد گرد ایک واضح شکن ڈال رہی تھیں۔

اس نے الشیبا صوبہ کی فرانسیسی زبان میں مسافروں کو باہر آنے کی دعوت دی اس نے نرم اور مہذب لہجے میں کہا "خواتین وحضرات، اُتر آئیے۔"

دو راہبائیں سب سے پہلے حکم بجا لائیں۔ ان کے انداز میں اولیاء کی سی تواضع تھی جو ہمیشہ اطاعت گزار رہتے ہیں۔ ان کے بعد نواب اور اس کی بیگم آئے اور ان کے پیچھے صنعتکار اور اس کی بیوی تھی۔ اس کے بعد لوازہ توند باہر نکالے ہوئے نکلا اور اس نے حسن اخلاق سے زیادہ مصلحت کے پیش نظر افسر کو سلام نیاز پیش کیا۔ افسر نے جو کہ تمام طاقتور لوگوں کی طرح گستاخ، بغیر کچھ کہے اس کی طرف دیکھا۔ "چربی کا گولا" اور کارنودے اگرچہ دروازے کے قریب تھے۔ مگر سب سے آخر میں اترے وہ دشمن کے سامنے سرکش اور سنجیدہ تھے۔ موٹی لڑکی نے اپنے آپ پر قابو پانے اور خاموش رہنے کی کوشش کی۔ جمہوریت پسند کارنودے نے المیہ کے انداز میں ہاتھ ہلایا اس کی لمبی داڑھی کانپتی ہوئی

اور سُرخ تر ہوتی ہوئی معلوم ہوتی تھی - یہ دونوں اپنا وقار برقرار رکھنا چاہتے تھے - کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ایسے مواقع پر وہ اپنے عظیم ملک کی نمائندگی کرتے ہیں - موٹی لڑکی اپنے ساتھیوں کی اطاعت گزاری سے بیزار تھی - اس لئے اس نے کوشش کی اپنی ہمسایہ نیک چلن عورتوں سے زیادہ غرور کا مظاہرہ کرے اور وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس طرح کی مثال قائم کرے - اس لئے اس نے دشمن کے آگے نہ جھکنے کا رویہ جو سفر کے آغاز میں اختیار کیا تھا بدستور جاری رکھا -

وہ سرائے کے وسیع باورچی خانے میں داخل ہوئے - جرمن نے ان کے سفر سے متعلقہ کاغذات جن پر جنرل انچیف کے دستخط تھے طلب کئے - ان کاغذات میں ہر مسافر کا نام اس کی کیفیت اور پیشہ وغیرہ درج تھے - کاغذات کے معائینے اور مسافروں اور ان کے دستخطوں کے تقابل کے بعد اس نے کہ "سب درست ہے" اور باہر چلا گیا -

انہوں نے اطمینان کا سانس لیا - وہ ابھی تک بھوکے تھے - اس لئے رات کے کھانے کا آرڈر دیا گیا - کھانا تیار کرنے کے لئے آدھ گھنٹہ درکار تھا - چونکہ دو نوکر یہ کام سرانجام دے رہے تھے - اس لئے سب اپنے کمروں کی طرف چلے گئے وہ ایک برآمدے میں سے گزرے جو ایک چمکدار دروازے تک جا کر ختم ہو جاتا تھا -

جب میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے - تو سرائے کا مالک آیا - اس سے

پیشتر وہ گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا وہ دمہ کا مریض تھا اور اس کے گلے سے سانس لیتے وقت رگڑ کی سی آواز مسلسل آتی تھی۔ اسے فولنوی کا آبائی نام ملا تھا۔ اس نے پوچھا "کیا مس الزبتھ رُوسے یہاں ہے؟"

"چربی کے گولے" نے چونک کر کہا "یہ میرا ہی نام ہے"

"جرمن افسر آپ سے فوراً کچھ کہنا چاہتا ہے" سرائے کے مالک نے کہا۔

"میرے ساتھ"

"ہاں آپ کے ساتھ۔ اگر آپ ہی مس الزبتھ رُوسے ہیں"

وہ پریشان ہو گئی اور کچھ عرصہ غور کرنے کے بعد بولی۔ "یہ میرا ہی نام ہے۔ مگر میں نہیں جاؤں گی"

اس کے گرد و پیش ہلچل سی مچ گئی۔ ہر ایک نے اس فرمان پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس حکم کی علتِ غائی تک پہنچنے کی کوشش کی۔ نواب نے اس کے قریب جا کر کہا "مادام آپ غلطی پر ہیں۔ کیونکہ آپ کا انکار نہ صرف آپ کو بلکہ آپ کے ساتھیوں کو بھی مصیبت میں ڈال دے گا۔ صاحب اقتدار لوگوں سے ٹکر لینا بیکار ہے۔ جرمن افسر کی یہ درخواست کسی خطرے کا پیش خیمہ نہیں ہے۔ اور یہ ضروری کارروائی میں کسی فرو گذاشت کی بنا پر ہے۔"

سب نے نواب سے اتفاق کیا اور جانے کے لیے اس کی منت سماجت

کی اور اسے اس بات کا یقین دلا دیا کہ جانا ہی بہترین کام ہے۔ وہ نافرمانی کے انجام سے خائف تھے۔ آخرکار وہ بولی!

"میں یہ کام صرف آپ لوگوں کی خاطر کر رہی ہوں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں؟"

نواب کی بیگم نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "ہم سب اس کام کے لئے آپ کے ممنون ہیں۔"

وہ باہر چلی گئی۔ وہ کھانے سے پیشتر اس کا انتظار کرنے لگے ہر ایک کو اس جوشیلی اور گرم مزاج لڑکی کے بجائے نہ بلائے جانے کا افسوس تھا۔ اور ہر ایک اپنے دل میں وہ تقریر تیار کر رہا تھا جو بلائے جانے کی صورت میں اُسے کرنی چاہیئے تھی۔

دس منٹ گزرنے کے بعد وہ واپس آ گئی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ اور دامنِ صبر لبریز تھا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا "اُف۔ بدمعاش! بدمعاش!"

سب حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے اس کے گرد جمع ہوئے لیکن اس نے کوئی بات نہ کی۔ جب نواب نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے بڑے وقار سے جواب دیا!

"اس بات کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں

کہہ سکتی۔"

وہ سب شوربے کے طاس کے ارد گرد بیٹھ گئے گوبھی کی خوشبو آرہی تھی۔ خوف کے باوجود کھانا پُر لطف معلوم ہوتا تھا۔ سیب کی شراب جسے وہ راہبائیں اور لوازم کفایت شعاری کے طور پر پیتے تھے۔ لذیذ تھی دوسروں نے بہتر شراب مانگی مگر کارنودے نے جَو کی شراب (بیئر) طلب کی۔ اس کا بوتل کھولنے کا ڈھنگ کچھ نرالا تھا۔ وہ پہلے اس میں بلبلے پیدا کرتا تھا۔ اور بڑی احتیاط سے گلاس بھرتا اور اسے اٹھاکر روشنی کے سامنے رکھ کر اس کے رنگ کی داد دیتا تھا۔ جب وہ پیتا تھا تو اس کی بڑی داڑھی جس پہ اس کی پیاری شراب میں سے نکلی ہوئی جھاگ لگی ہوتی تھی لطف سے رقص کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے نظریں ترچھی رکھی ہوتیں تھیں تاکہ اس کی محبوب شراب اس کی نظروں سے اوجھل نہ رہے۔ وہ اپنے انداز سے ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس مقصد کو پورا کر رہا ہے۔ جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے۔ گویا یہ کہنا چاہیئے کہ اس کے ذہن میں اس کی زندگی کے دو عظیم جذبوں کا اتصال ہو رہا تھا۔ سنہری بیئر اور انقلاب یہی دو اس کے ذہن میں یکجا تھے۔ اور جب وہ ایک کو چکھتا تھا۔ تو دوسرے کے متعلق ضرور سوچتا تھا۔ موسیو اور مادام فولنوی میز کے آخر میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ خاوند تو پھٹے ہوئے انجن کی طرح کھڑکھڑ کر رہا تھا۔ کیونکہ کھانا کھاتے ہوئے بولنے میں اسے سانس لیتے وقت دشواری پیش آتی

مگر اس کی بیوی ایک لمحہ بھر کے لئے بھی خاموش نہ بیٹھی۔ اس نے جرمنوں کی آمد سے متعلقہ اپنے تمام احساسات بیان کر دیئے۔ جو کچھ انہوں نے کہا اور کیا وہ سب اس عورت نے کہہ سنایا۔ وہ ان کو کوس رہی تھی۔ کیونکہ اسے اُن کے لئے کچھ رقم خرچ کرنی پڑی تھی۔ اور اس لئے بھی کہ اس کے دو لڑکے فوج میں تھے۔ وہ نواب کی بیگم کو خاص طور پر مخاطب کرتی تھی اور اس اعلیٰ درجے کی خاتون سے گفتگو کر کے اترا رہی تھی۔ جب وہ کوئی نازک بات کہتے ہوئے اپنی آواز کو نیچا کر لیتی تو اس کا خاوند قطع کلامی کرتے ہوئے کہتا " مادام فلنومی۔ بہتر ہوتا اگر آپ خاموش رہتیں۔" مگر وہ اس کی طرف توجہ نہ دیتے ہوئے اس انداز میں اپنی بات جاری رکھتی۔

" ہاں، مادام وہ لوگ ہمارے آلوؤں کے ساتھ گوشت نہیں کھاتے بلکہ گوشت کے ساتھ آلو کھاتے ہیں۔ اور وہ صاف ستھرے بالکل نہیں۔ گستاخی معاف وہ نہایت ہی غلیظ ہیں۔ وہ گھنٹوں ورزش کرتے رہتے ہیں۔ سب میدان میں جمع ہو کر کبھی پریڈ کرتے ہوئے آگے جاتے ہیں اور کبھی پیچھے آتے ہیں۔ کبھی ادھر مڑتے ہیں کبھی ادھر وہ اپنے ملک میں شاید زمین کی کاشت کرتے ہوں گے۔ یا کم از کم وہاں سڑکوں پر کام کرتے ہوں گے۔ لیکن مادام، نہیں۔ یہ فوجی کسی کے کام نہیں آتے۔ غریب لوگوں کو انہیں کھلانا پڑتا ہے ورنہ یہ انہیں قتل کر دیتے ہیں۔ میں ایک ناخواندہ بڑھیا ہوں مگر جب میں

لوگوں کو صبح سے شام تک مسلسل کام کر کے اپنی صحت کو خطرے میں ڈالتے ہوئے دیکھتی ہوں تو میں کہتی ہوں کہ جب اتنے آدمی بیکار ہے تو دوسروں کے لئے اتنی تکلیف گوارا کرنا کس قدر غیر ضروری ہے۔ کیا انسانوں کو قتل کرنا بری بات نہیں۔ خواہ وہ جرمن ہوں یا انگریز، خواہ اہل پولینڈ ہوں، خواہ اہل فرانس؟

جب کوئی شخص کسی ایسے آدمی سے انتقام لیتا ہے جس نے اسے نقصان پہنچایا ہوتا ہے تو اس کا یہ فعل مذموم سمجھا جاتا ہے اور اُسے سزا دی جاتی ہے مگر جب وہ ہمارے لڑکوں کو یوں گولیوں کا نشانہ بناتے ہیں گویا وہ شکار کے جانور ہوں تو انہیں انعام دیا جاتا ہے اور جو سب سے زیادہ تباہی مچاتا ہے اُسے یقیناً اعزاز بخشا جاتا ہے۔ میں اس بات کو کبھی نہیں سمجھ سکتی! کبھی بھی نہیں!"

کارنورے نے بلند آواز میں کہا: "اگر کوئی اپنے پُر امن ہمسایہ پر حملہ کر دے تو جنگ واقعی وحشت اور بربریت ہوتی ہے۔ مگر اپنے ملک کے دفاع کی خاطر لڑی جائے تو یہی جنگ ایک مقدس فریضہ بن جاتی ہے۔"

بوڑھی عورت نے اپنا سر جھکاتے ہوئے کہا "ہاں دفاع کی اور بات ہے۔ مگر کیوں نہ ان بادشاہوں کو قتل کرنا اپنا فریضہ بنا لیا جائے، جو اپنی خوشی کی خاطر جنگ کا آغاز کرتے ہیں؟"

کارنودے کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ "مرحبا۔ میری پیاری دیہاتی عورت مرحبا" اس نے کہا۔

موسیو کاغے لاماد وں بڑے غور سے سوچنے لگا۔ اگرچہ وہ بڑا صنعتکار ہونے کی حیثیت سے متعصب تھا مگر اس دیہاتی عورت کی دانائی نے اُسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر یہ بے کار اور شرارتی لوگ اور یہ فوجی جو ابھی تک کاروباری نقطہ نظر سے فضول کام میں لگے ہوئے ہیں کسی بہت بڑے صنعتی کام میں کھپا دیئے جائیں تو ملک میں دولت کی کس قدر فراوانی ہو خواہ یہ صنعتی کام صدیوں میں ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ لوازو اپنی نشست چھوڑ کر سرائے کے مالک سے سرگوشی کرنے کے لئے گیا۔ وہ لوازو کے مذاق سن کر ہنستے اور جھومنے لگا۔ اور اس سے جرمن فوج کی روانگی کے بعد موسم بہار کے لئے شراب کی چھ پیٹیاں خرید لیں۔ چونکہ وہ تھکن سے چور تھے اس لئے کھانا ختم ہوتے ہی آرام کے لئے چلے گئے۔ مگر لوازو جس نے کچھ مشاہدہ کیا تھا اپنی بیوی کو بستر پہ لٹا کر سوراخ میں سے دیکھنے لگا وہ برآمدے کے اسرار معلوم کرنا چاہتا تھا۔ آدھ گھنٹے کے بعد اُسے کسی کے ٹٹولنے کی آواز آئی اس نے جلدی سے دیکھا تو اُسے "چربی کا گولہ" دکھائی دی وہ کشمیری شال پہنے اور زیادہ موٹی معلوم ہوتی تھی۔ وہ موم بتی لئے برآمدے کے صدر دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ ایک جانب دروازہ کھلا اور کارنودے اس کے پیچھے

پیچھے آگیا۔ وہ سرگرشی کرنے کے بعد ٹھہر گئے۔ "چربی کا گولہ" اپنے کمرے کے دروازے کی پوری قوت کے ساتھ حفاظت کر رہی تھی۔ بدقسمتی سے لوازو ان کی پوری گفتگو نہ سن سکا مگر جب انہوں نے اپنی آوازیں بلند کیں تو اس نے چند جملے سن ہی لئے۔ کارنودے نے پُر زور اصرار کرتے ہوئے کہا:

"آؤ بھی نا!

تم بیوقوف عورت ہو۔ آخر اس میں نقصان ہی کیا ہے؟"

اس نے غصّے سے جواب دیا: "نہیں۔ پیارے۔ کچھ ایسے لمحات بھی ہوتے ہیں جب کوئی کام بے موقع معلوم ہوتا ہے۔ یہاں یہ کام ایک شرمناک حرکت ہوگی" مگر وہ اس کی بات نہ سمجھا اور وجہ دریافت کرنے لگا اس پر وہ چیخ کر بولی: "وجہ؟ کیا وجہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ جرمن یہاں موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے ساتھ کے کمرے ہی میں ہوں۔"

وہ خاموش ہوگیا۔ محب وطن طائفہ کی شرم نے جیسے دشمن کے قرب میں اس کے ساتھ ہمکنار ہونے میں مضائقہ تھا اس کی غیرت کو بیدار کر دیا تھا۔ وہ فقط اس کا بوسہ لیکر اپنے کمرے میں چھلانگ لگاتے ہوئے واپس چلا گیا۔

لوازو نے بھی جوش میں آکر سوراخ چھوڑ کر کمرے میں قلابازی بھری، پاجامہ پہنا، ہڈیوں کے ڈھانچے جیسی بیوی پر سے کپڑا اٹھا بوسہ

لیکر جگا دیا اور کہا "کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو پیاری؟"

ہر طرف خاموشی تھی کہ اچانک کسی غیر معروف مقام سے خراٹوں کی صدا بلند ہوئی ہو سکتا ہے کہ یہ صلاتہ خانے سے آرہی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ یہ آواز مکان کے بالائی کمرے سے آرہی ہو۔ یہ آواز کرخت، مسلسل، بھاری اور طویل تھی، جیسے کوئی بڑی دیگچی آگ پر رکھی ہو۔ یہ موسیو فولنوی سو رہا تھا۔

اگلے دن چونکہ انہیں صبح آٹھ بجے روانہ ہونا تھا۔ اس لئے وہ سب باورچی خانے میں جمع ہوئے۔ مگر گاڑی جس کی چھت برف سے ڈھکی ہوئی تھی صحن میں ویسی کی ویسی پڑی تھی۔ اس میں نہ گھوڑے جوتے گئے تھے۔ اور نہ ہی اس کا کنڈیکٹر موجود تھا۔ انہوں نے اسے اصطبل، گھاس اور گاڑی خانے میں تلاش کیا مگر بے سود۔ پھر وہ اس کی تلاش میں شہر میں دوڑے وہ ایک چوک میں آنکلے جہاں ایک گرجا اور کچھ نیچے مکان تھے۔ کچھ جرمن سپاہی بھی نظر پڑے۔ پہلا جرمن سپاہی جو انہیں نظر آیا۔ وہ آلو چھیل رہا تھا۔ دوسرا دور ایک حجام کی دکان صاف کر رہا تھا۔ ایک اور سپاہی جس کی گھنی داڑھی نے اس کی آنکھوں تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ایک تنگ کرتے والے بچے کی دیکھ بھال کر رہا تھا اُسے جھولا جھلا رہا تھا اور اُسے راضی کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ دیہاتی عورتیں جن کے خاوند فوج میں دور

کہیں گئے ہوئے تھے۔ اپنے فرمانبردار فاتحین سے اپنے ہاتھ کے اشاروں سے کام کروا تی تھیں جیسے لکڑی کاٹنا، شوربا پکانا، قہوہ پینا وغیرہ وغیرہ۔ ایک بیچارہ تو اپنی گستاخ بڈھی میزبان کی معافی دھو رہا تھا۔

ژاب نے حیران ہوکر ایک پادری سے جو گرجا سے باہر آرہا تھا کچھ سوالات کئے بڑے میاں نے جواب دیا۔

"آہ! یہ لوگ ظالم نہیں ہیں۔ یہ وہ جرمن نہیں ہیں جن کے متعلق ہم سنتے ہیں۔ یہ کسی دور کے مقام سے آئے ہیں مجھے خبر نہیں یہ کہاں سے آئے ہیں۔ وہ اپنے وطن میں اپنے پیچھے بیوی بچے چھوڑ کر آئے ہیں۔ یہ جنگ ان کے لئے خوشگوار چیز نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے گھروں کو یاد کرکے روتے ہیں۔ وہ بھی اتنے ہی غم زدہ ہیں جتنے کہ ہم ہیں۔ اس وقت یہاں کوئی مصیبت نہیں کیونکہ سپاہی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے اور اس طرح کام کرتے ہیں جسطرح وہ اپنے گھروں میں کام کرتے تھے۔ جناب عالی۔ غریب لوگوں کے لئے ایک دوسرے کی مدد کرنا ضروری ہے۔ یہی عظیم صفات ہیں جنہیں جنگ نمایاں کرتی ہے۔

کارنودے کو فاتحین اور مفتوحین کے درمیان اچھے تعلقات دیکھکر کوفت ہوتی تھی۔ اس لئے وہ سرائے میں اپنے کمرے میں بند رہنا بہتر سمجھتا تھا۔ لوازو کو اس موقعے پہ مذاق سوجھا اس نے کہا: "وہ زمین

کو از سرِ نو آباد کریں گے۔"

موسیو کاغنے لاماروں نے سنجیدگی سے کہا: "وہ تلافی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

انہیں ڈرائیور نہیں مل رہا تھا۔ بالآخر انہوں نے اسے دیہات کے قہوہ خانے میں ڈھونڈ نکالا۔ وہ ایک فوجی افسر کے ساتھ دوستانہ طریقے پر میز کے سامنے بیٹھا تھا۔ نواب نے اس سے کہا:

"کیا تمہیں صبح آٹھ بجے تیار رہنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا؟"

"جی ہاں۔ لیکن جناب مجھے ایک دوسرا حکم دیا گیا ہے"

"وہ کس نے دیا"

"بخدا جرمن افسر نے"

"وہ کیا حکم ہے؟"

"گھوڑے نہ جوتنے کا"

"کیوں؟"

"مجھے اس کی کچھ خبر نہیں۔ اس سے جا کر پوچھئے۔ انہوں نے مجھے گھوڑے نہ جوتنے کا حکم دیا ہے۔ اس میں گھوڑے نہیں جوت سکتا۔ بس اتنی ہی بات ہے"

"کیا اس نے تمہیں خود یہ حکم دیا؟"

"نہیں جناب سرائے کے مالک نے اس کا حکم مجھ تک پہنچایا"

"وہ کب"

"کل رات جب میں سونے جا رہا تھا"

"تینوں آدمی پریشانی کی حالت میں واپس آئے۔ انہوں نے موسیو فولنوی کو بلوایا مگر نوکر نے بتایا کہ دمہ کے عارضہ کی وجہ سے وہ کبھی دس بجے سے پیشتر نہیں اٹھتا۔ اور اس نے یہ حکم دے رکھا ہے کہ اسے سوائے آگ لگنے کی صورت میں اس سے پیشتر نہ جگایا جائے۔

وہ افسر سے بات کرنا چاہتے تھے مگر یہ ممکن نہ تھا کیونکہ وہ سرائے میں رہنے کے باوجود شہری معاملات میں سوائے مسٹر فولنوی کے کسی اور سے بات نہیں کرتا تھا۔ اس لئے انہیں انتظار کرنا پڑا عورتیں کمروں میں واپس چلی گئیں اور بے سود کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

کارنودے باورچی خانے میں آگ کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے ایک چھوٹی میز اور بیئر کا ڈبہ منگوایا اور اپنا پائپ جسکی جمہوریت پسندوں میں وہی اہمیت تھی جو خود اسکی اپنی تھی نکالا۔ کیونکہ یہ پائپ کارنودے کے کام آکر ملک کے کام آرہا تھا۔ یہ ایک بڑھیا قسم کا خوبصورت رنگ کا پائپ تھا۔ یہ اسی قدر سیاہ تھا۔ جس قدر کہ اس کے مالک کے دانت۔ یہ منحنی خوشبودار، چمکدار اور ہلکا پھلکا پائپ اس کی شخصیت کی تکمیل

کرتا تھا۔ وہ بے حرکت بیٹھا رہا۔ اس کی نظریں شراب کی جھاگ اور آگ کے شعلے پر جمی ہوئی تھیں جب بھی وہ گھونٹ بھرتا تو اپنی لمبی اور پتلی انگلیاں اپنے سفید اور تھوڑے سے بالوں میں سے مزید بڑے اطمینان کے ساتھ گزارتا تھا۔ اس کے بعد مونچھوں پر لگی ہوئی جھاگ کو چوستا تھا۔

لوازوؔ ٹانگیں سیدھی کرنے کے بہانے سے اپنی شراب پرچون فروشوں کے پاس فروخت کرنے چلا گیا۔ نواب اور صنعتکار سیاسیات پر گفتگو کرنے لگے۔ وہ فرانس کا مستقبل دیکھ رہے تھے۔ ایک اورلیانؔ میں یقین رکھتا تھا دوسرا کسی غیبی مددگار میں جو اس وقت ظاہر ہوگا۔ جب سب مایوس ہو چکے ہونگے، شاید وہ کیپلینؔ یا کوئی جون آف آرکؔ ہو اور ہو سکتا ہے وہ نپولینؔ اول ہی ہو۔ کاش شہزادہ اس قدر کم عمر نہ ہوتا!

کارنودےؔ ان کی باتیں سُن کر یوں مسکرا رہا تھا جیسے اُسے نوشتۂ تقدیر کی خبر تھی۔ اس کا پائپ باورچی خانے کو مہکا رہا تھا۔

دس بجتے ہی موسیوؔ فولنوی نمودار ہوا۔ انہوں نے اِس سے جلدی جلدی سوالات کئے مگر وہ دو تین دفعہ یہی الفاظ بغیر کسی ردوبدل کے دہرا سکا۔

"افسر نے مجھ سے کہا: "موسیو فولنوی" تم اس بات کا خیال رکھو کہ ان مسافروں کے لئے کل گاڑی میں گھوڑے نہ جوتے جائیں۔

میں نہیں چاہتا کہ وہ میرے حکم کے بغیر یہاں سے چلے جائیں۔ یہی کافی ہے"

اُنہوں نے افسر سے ملنا چاہا۔ نواب نے اپنا کارڈ بھیجا جس پر موسیو کاسنے لاماروں نے اپنا نام اور اپنے تمام خطابات لکھ دیئے تھے۔ افسر نے کہلا بھیجا کہ وہ انہیں ناشتہ کرنے کے بعد یعنی ایک بجے ملاقات کا موقع دے گا۔

خواتین نے دوبارہ آکر بے اطمینانی کے باوجود تھوڑا سا کھانا کھایا۔ "چربی کا گولا" بیمار اور سخت پریشان معلوم ہوتی تھی وہ اپنی کافی ختم ہی کر رہے تھے کہ پیغام آیا کہ افسر مردوں سے ملنے کے لئے تیار ہے۔ لوازو ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ لیکن جب انہوں نے اپنے معاملے کی اہمیت کو بڑھانے کے لئے کارنو دے کو ساتھ لینا چاہا تو اس نے فخریہ انداز میں کہا کہ اُسے جرمنوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ بدستور آگ کے قریب بیٹھا رہا اور مزید بیئر (BEER) منگوائی۔

تینوں آدمی سیڑھیاں چڑھنے لگے اور انہیں سرائے کے بہترین کمرے میں داخل کیا گیا جہاں افسر نے آرام کرسی پر دراز ہو کر ان کا استقبال کیا۔ اس کے پاؤں انگیٹھی پر تھے وہ ایک بھڑکیلے رنگ کا چوغہ جو کسی بدذوق شہری کے گھر سے اڑایا گیا تھا پہنے ہوئے تھا۔ نہ تو وہ کھڑا ہوا اور نہ ہی انہیں کسی طرح سے خوش آمدید کہی۔ بلکہ ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

یہ اُس فطری کمینگی کا جس نے فوجی فاتح کا روپ دھار رکھا تھا۔ ایک شاندار مظاہرہ تھا۔

چند لمحے گزرنے کے بعد اس نے پوچھا "تم کیا چاہتے ہو؟"
نواب نے سب کی طرف سے گفتگو کرنے کا ذمہ لیتے ہوئے کہا: "جناب ہم اپنی راہ لینا چاہتے ہیں"

"نہیں"

"کیا میں اس انکار کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

"کیونکہ میں نہیں چاہتا"

"لیکن میں جناب سے مودبانہ عرض کرتا ہوں کہ آپ کے جنرل انچیف نے ہمیں ڈی ایپ جانے کی اجازت دے دی ہے اور ہم نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو آپ کی ناراضگی کا سبب بن سکے۔"

"میں نہیں چاہتا۔ بس یہی کافی ہے۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں"
تینوں سلام کر کے واپس آ گئے۔

سہ پہر کو صف ماتم بچھ گئی۔ وہ اس جرمن کی من مانی کو سمجھ نہ سکتے تھے اور ان کے خیالات انہیں تکلیف دے رہے تھے۔ ہر شخص باورچی خانے میں ٹھہرا ہوا صورت حال پہ نہ ختم ہونے والی بحث کر رہا تھا۔ وہ ہر قسم کی انہونی باتوں کا تصور کر رہے تھے۔ شاید انہیں بطور ضمانت رکھا جا

جا رہا تھا۔ لیکن کس مقصد کیلئے ؟ یا نہیں قیدی بنایا جا رہا تھا یا ہو سکتا تھا اُن سے کثیر معاوضہ طلب کیا جائے۔ اس خیال نے افراتفری پھیلا دی تھی۔ دولتمند زیادہ خائف تھے۔ انہوں نے ابھی سے یہ تصوّر کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اپنی جانوں کے عوض اس گستاخ افسر کو سونے کی بوریاں دے رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ذہن پر ایسا جھوٹ گھڑنے کے لئے زور دیا جس سے وہ اپنی دولت کو چھپا سکیں اور اپنے آپ کو غریب اور نادار ظاہر کریں۔ لوازو نے اپنی گھڑی کی زنجیر اتار کر جیب میں رکھ لی۔ رات پڑنے لگی تو ان کے اندیشے اور بھی بڑھ گئے۔ شمع روشن کی گئی۔ چونکہ کھانے کو ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ اس لئے مادام لوازو نے تاش کھیلنے کی تجویز پیش کی تاکہ دل بہلے رہیں۔ سب نے یہ تجویز قبول کر لی۔ کارنودے نے بھی پائپ پی لینے کے بعد حسن اخلاق ملحوظ رکھتے ہوئے اس کھیل میں حصہ لیا۔

نواب نے تاش پھینٹ کر پتے بانٹے اور "چربی کے گولے" کو پہلے ہی ہاتھ اکتیس آ گئے۔ جلد ہی دلچسپی اس حد تک بڑھ گئی کہ دلوں کا خوف دور ہو گیا۔ پھر کارنودے نے دیکھا لوازو کا گھرانہ پتے بازی کا عادی تھا۔

جب وہ عشائیہ کھانے کے لئے جا رہے تھے تو موسیو فولنوی

دوبارہ نمودار ہوا اور خرخر کرتی ہوئی آواز میں کہنے لگا: "مجھے جرمن افسر نے یہ پوچھنے کا حکم دیا کہ کیا مس الزبتھ روسے نے اپنا ارادہ بدلا ہے۔ یا نہیں"

"چربی کا گولہ" کھڑی کی کھڑی رہ گئی وہ زرد تھی۔ یکایک وہ لال پیلی ہو گئی اُسے اس قدر غصہ آیا کہ وہ بول نہ سکتی تھی۔ آخر وہ گرج کر بولی: "تم اس غلیظ حیوان، اس احمق، اس جرمن پہاڑی کوّے سے کہہ دو کہ میں کبھی اپنا ارادہ نہ بدلوں گی۔ سمجھتے ہو؟ کبھی نہیں، کبھی نہیں، کبھی نہیں، !"

سرائے کا مالک چلا گیا۔ سب "چربی کے گولے" کے گرد جمع ہو کر اس سے سوال کرنے لگے اور اس کی آمد کے راز کے انکشاف کے لیے منتیں کرنے لگے۔ پہلے تو وہ انکار کرتی رہی۔ آخر تنگ آ کر بولی: "وہ کیا چاہتا ہے؟ کیا آپ لوگ واقعی یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ وہ میرے ساتھ رات گزارنا چاہتا ہے"

کسی کے منہ سے لفظ نہ نکلتا تھا اور نفرت کے جذبات ابھر رہے تھے۔ کارنودے نے اس زور سے میز پر مکّا مارا کہ گلاس ٹوٹ گیا۔ اس بدمعاش افسر کو مطعون کیا گیا۔ سب اس کے مقابلے کے لئے متحد ہو گئے اور ہر طرف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی گویا کہ ہر شخص سے اس لڑکی جیسی قربانی کا مطالبہ

کیا گیا تھا۔ نواب نے بیزار ہو کر کہا کہ یہ لوگ پرانے زمانے کے وحشیوں کی طرح ہیں۔ عورتوں نے "چربی کے گولے" سے پر زور ہمدردی کا اظہار کیا۔ نیک راہباؤں نے سر جھکا لئے اور کچھ نہ کہہ سکیں۔ وہ صرف کھانے کے وقت لوگوں کے سامنے آتی تھیں۔

جب غصہ اتر گیا تو سب نے کھانا کھایا۔ مگر گفتگو بند ہو گئی سب سوچ میں پڑ گئے۔

خواتین جلد آرام کے لئے چلی گئیں۔ مردوں نے جو کہ تمباکو پی رہے تھے تاش کے کھیل کا اہتمام کیا اور موسیو فولنوی کو بھی کھیل کی دعوت دی۔ کیونکہ وہ اس سے جرمن افسر کی مزاحمت پر قابو پانے کے سلسلے میں چند سوالات پوچھنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ پتوں کے سوا کسی اور چیز کے متعلق سوچتا ہی نہ تھا۔ وہ بغیر سنے یا بغیر جواب دیئے بار بار یہی کہتا تھا: "جناب! کھیل کی طرف دھیان دیجئے۔ کھیل کی طرف ...." اس کی توجہ اس قدر مرکوز تھی کہ وہ کھانسنا تک بھول گیا۔ اس کے سیٹیاں بجانے والے پھیپھڑوں نے دمے کے تمام راگ الاپے۔ گہری عمیق سروں سے لیکر اُس کم عمر مرغے کی تیز چیخ جیسی آواز تک جو بانگ دینے کی کوشش کر رہا ہو۔ ہر طرح کی آواز نکالی۔ وہ اتنا محو ہو گیا کہ جب اس کی بیوی بہت عرصہ سو لینے کے بعد اُسے بلانے آئی تو اِس نے تاش کا کھیل چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ وہ اکیلی واپس چلی گئی کیونکہ

وہ "طائرِ صبح" تھی جو سورج نکلتے ہی اٹھ کھڑی ہوتی تھی اور اس کا خاوند "بومِ شب" تھا جو اپنے دوستوں کے ساتھ رات بھر جاگنے کے لئے تیار رہتا تھا۔ اس نے بیوی کو چلا کر کہا "میرے بالائی آمیز چوزے کو آگ کے قریب رکھ چھوڑنا" اور یہ کہکر کھیل میں منہمک ہو گیا جب مسافروں کو یقین ہو گیا کہ وہ اس سے کوئی کام کی بات معلوم نہیں کر سکتے تو انہوں نے اعلان کیا کہ تاش کا کھیل ختم کرنے کا وقت ہو گیا ہے اور ہر ایک سونے کے لئے چلا گیا۔

اگلے دن وہ ذرا جلدی بیدار ہوئے۔ انہیں جانے کی موہوم سی اُمید تھی اور سرائے میں ایک دن اور گذارنے کے خوف نے اس اُمید کو قوی تر کر دیا تھا۔

افسوس! گھوڑے بدستور اصطبل میں ہی رہے اور ڈرائیور پھر غائب ہو گیا۔ چونکہ وہ اور کچھ نہیں کر سکتے تھے اس لئے وہ باہر نکل آئے اور گاڑی کے ارد گرد چلنے لگے۔

ناشتے کے وقت سب غمگین تھے۔ یہ بات تو صاف نظر آ رہی تھی۔ کہ "چربی کے گولے" کے لئے سرد مہری کے جذبات پیدا ہو چکے تھے اور مشیرِ شب نے ان کے فیصلوں کو قدرے بدل دیا تھا۔ اب تو ان کی قریب قریب یہ خواہش تھی کہ جرمن افسر نے خفیہ طور پر اس لڑکی کو حاصل

کر لیا ہوتا کہ اس کے ساتھیوں کو صحیح مسرت آمیز تعجب ہو۔ اس سے آسان بات اور کیا ہو سکتی تھی؟ مزید برآں اس کی خبر کس کو ہو سکتی تھی؟ وہ افسر کو یہ کہہ کر اس نے ان کی درماندگی پر رحم کھایا ہے اپنی ٹانگ اونچی رکھ سکتی تھی اس کو اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے!

مگر ابھی تک اپنے ان خیالات کو کوئی بھی زبان پر نہ لایا تھا سہ پہر کو وہ بیکاری اور بیزاری سے ادھ موئے ہو رہے تھے۔ نواب نے گاؤں کی سیر کی تجویز پیش کی۔ ہر ایک نے گرم لبادہ اوڑھا اور یہ چھوٹا سا گروہ روانہ ہوا۔ کارنودے اور دو راہبائیں ان کے ساتھ شامل نہ ہوئیں۔ کارنودے آگ کے قریب بیٹھنا پسند کرتا تھا اور راہبائیں گرجے میں وقت گزارنا چاہتی تھیں۔

روز افزوں سردی بڑی بے رحمی سے ان کے ناک کان چھید رہی تھی۔ ان کے پاؤں اس قدر سُن ہو گئے تھے کہ قدم اٹھانا مصیبت معلوم ہوتا تھا جب وہ کھیت میں پہنچے تو وہ لامحدود سفیدی کے سبب خوفناک حد تک اداس دکھائی دیتا تھا۔ سب جلد ہی غم کے بوجھ سے چور دل اور گرمی اُمید سے عاری روحوں کے ساتھ واپس آ گئے۔ چار عورتیں آگے آگے چل رہی تھیں اور تین مرد اُن کے عین پیچھے تھے۔ لوازو نے جو تمام معاملے کو سمجھتا تھا، اچانک پوچھا کہ کیا یہ لڑکی انہیں ایسی جگہ میں دیر تک رکھے گی

نواب جوکہ ہمیشہ مروّت برتتا تھا کہنے لگا کہ ہم ایک لڑکی سے اتنی شدید قربانی کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ بجز اس کے کہ وہ اپنی مرضی سے یہ قربانی دے موسیو کا غے لامادوں نے کہا کہ اگر فرانسیسی دی ایپ سے واپس لوٹے، جس امر کا کہ کافی امکان تھا، تو ٹوٹ کے مقام پر ضرور جنگ ہو گی۔ اس خیال نے باقی کے دو حضرات کو فکر مند کر دیا۔

"کیا ہم پیدل نہیں جا سکتے؟" لوانڈو نے کہا۔

نواب نے جواب دیا "اس برف میں ہم ایسا کیونکر کر سکتے ہیں۔ اور خاص طور پر جب ہماری بیویاں ہمارے ساتھ ہیں۔ اور بالفرض ہم یہ اقدام کر بھی لیں تو ہم دس منٹ میں پکڑے جائیں گے۔ اور قیدی بن کر واپس لوٹیں گے۔ اور پھر انہیں فوجیوں کے رحم و کرم پر ہوں گے۔"

یہ درست تھا اس لئے وہ سب خاموش ہو گئے۔ خواتین اپنے کپڑوں کے متعلق باتیں کر رہی تھیں۔ مگر ایک طرح کا ضبط ان میں انتشار پیدا کر رہا تھا۔ یکایک بازار کے دوسرے سرے پر افسر نکل آیا۔ اس کا بھڑ کی طرح کا لمبوترا سا وردی میں ملبوس جسم برف کے بنائے ہوئے افق کے کنارے پر تھا۔ اور وہ اپنے گھٹنے چوڑے کر کے چل رہا تھا۔ یہ خاص فوجی چال تھی۔ جو بڑی احتیاط سے سیاہ کئے گئے جوتوں کو دھبوں سے بچانے کے لئے چلی جاتی ہے۔

اس نے عورتوں کو جھک کر سلام کیا اور مردوں کی طرف نفرت سے دیکھا۔ تینوں مردوں نے اس طرف نہ دیکھ کر اپنا وقار برقرار رکھا مگر لوازو نے اپنا ہیٹ اٹھا کر اُسے سلام کیا۔

"چربی کا گولا" کا چہرہ اور کان سُرخ ہو گئے" اور تین شادی شدہ عورتوں نے اس عورت کی معیت میں جسے اس نے اپنی ہوس کا آلۂ کار بنانا چاہا تھا، اس افسر سے ملاقات کی ذلت پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ مگر انہوں نے اس کے، اس کے قد و قامت اور اس کے چہرے کے متعلق باتیں کیں۔ مادام کاشیے لاماندوں جو بہت سے فوجی افسروں کو جانتی تھی اور خود کو ان کا نقاد سمجھتی تھی اس فوجی افسر کو بُرا نہیں گردانتی تھی۔ بلکہ اُسے تو اس کے فرانسیسی نہ ہونے کا افسوس تھا۔ کیونکہ ایسا ہونے کی صورت میں وہ اتنا اچھا گھوڑ سوار ہوتا کہ سب عورتیں اُس پہ لٹو ہو جاتیں۔

جب وہ مکان میں واپس پہنچے تو کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ کیا کرنا چاہئیے۔ معمولی معمولی باتوں پہ تلخ کلامیاں بھی ہوئیں۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا اور کھانے کے فوراً بعد ہر ایک اپنے کمرے میں سو کر وقت کاٹنے کے لئے چلا گیا۔

دوسری صبح وہ اترے ہوئے چہرے اور ٹوٹے ہوئے دل لئے نیچے اترے۔ عورتیں "چربی کے گولے" سے بات تک کرنے کی روادار

نہ تھیں۔

ایک گھنٹی بجنے لگی۔ یہ بپتسمہ کیلئے بجائی گئی تھی، موٹی ڈرٹ کی کا بھی ایک بچہ تھا جو دیہات میں پرورش پا رہا تھا۔ اس نے ایک سال سے نہ تو اسے دیکھا تھا اور نہ اس کے متعلق کبھی سوچا تھی۔ اب ایک، بچے کی رسم بپتسمہ کی ادائیگی کے خیال نے اس کے دل میں اس کے اپنے بچے کے لئے رقت پیدا کر دی اور وہ رسم بپتسمہ کے موقع پہ موجود ہونے کی خواہش کرنے لگی۔ اس کے جانے کے بعد ہر ایک نے دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر انہوں نے اپنی کرسیاں ایک دوسرے کے قریب کر لیں کیونکہ وہ کوئی فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ لوازو کو خیال آیا "چربی کے گولے" کو تنہا چھوڑ دیا جائے اور باقی سب چلے جائیں۔

موسیو فولنوی کو یہ بات سمجھا کر افسر کے پاس بھیجا گیا لیکن وہ جلد ہی واپس آ گیا کیونکہ فطرتِ انسانی کے واقف جرمن نے اسے باہر نکال دیا تھا۔ اس نے یہی ظاہر کیا کہ جب تک اسکی خواہش کی تکمیل نہ ہو گی، وہ سب کو روکے رکھے گا۔

مادام لوازو کی کمینہ فطرت نے ان الفاظ کا روپ دھارا:

"ہم یہاں بڑھاپے کے سبب مرنے کے لئے ٹھہرنے کو تیار نہیں ہیں جب اس عورت کا کاروبار ہی یہی ہے کہ ہر قسم کے مردوں سے گزارہ کرے تو

اُسے ایک کے مقابلے میں دوسرے کو رد کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے۔ میں آپ کو یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اس نے ردان میں ہر ایک کو دعوت دی ہے یہاں تک کہ کوچوان تک بھی محروم نہیں رہے۔ ہاں مادام، پولیس افسر کا کوچوان! میں اُسے خوب جانتی ہوں، وہ ہمارے ہاں سے شراب خریدا کرتا تھا۔ اور یہ خیال کس قدر سوہان روح ہے کہ ہمیں اس فریب کار عورت، اس چھنال کی بدولت اس قدر پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے اس افسر کو نیک اطوار پایا ہے۔ شاید وہ بہت عرصہ تک محرومیوں کا شکار رہا ہے۔ اور یقیناً وہ ہم تینوں کو اس پہ ترجیح دے سکتا ہے۔ مگر نہیں۔ وہ سب کی مشترکہ ملکیت پہ ہی قناعت کر رہا ہے۔ وہ شادی شدہ عورتوں کی عزت کرتا ہے اور ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ وہ مالک و مختار ہے۔ وہ صرف خواہش کرنے سے ہی ہمیں اپنے سپاہیوں کی مدد سے جبراً حاصل کر سکتا ہے۔"

دو عورتوں نے جھرجھری لی۔ حسین مادام کاغنے لامادول کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور وہ قدرے زرد ہو گئی گویا اس نے خیال ہی خیال میں یہ فرض کر لیا تھا۔ کہ افسر نے اُسے جبراً پکڑ لیا ہے۔

مردوں نے صورت حال پہ بحث کی۔ غضبناک لوازو اس مردود لڑکی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر دشمن کے حوالے کر دینے کے حق میں تھا۔

لیکن نواب جس کی تین پشتیں سفارت کے ممتاز عہدے پر سرفرازرہ چکی تھیں ۔ اور جسے قدرت نے سیاسی مزاج بخشا تھا ۔ کسی اچھوتی چال سے کام نکالنا چاہتا تھا ۔ اس نے کہا " کچھ فیصلہ کرنا ہی بہتر ہے ،، پھر انہوں نے کچھ سازباز کی ۔ عورتیں یکجا رہیں ۔ ان کی آوازیں نیچی تھیں ۔ ہر ایک مشورہ دے رہی تھی ۔ اور عام بحث ہو رہی تھی ۔ ہر طرح کی ہم آہنگی تھی ۔ خواتین کے پاس غیر معمولی باتیں کہنے کے لئے دلفریب اور نازک انداز بیاں مختلف رنگ و آہنگ کے الفاظ تھے ۔ ایسی محتاط زبان استعمال ہو رہی تھی کہ ایک اجنبی کچھ نہ سمجھ سکتا تھا ۔ لیکن عصمت کی ہلکی سی باڑ جو دنیا کی ہر عورت کے گرد ہوتی ہے محض سطحی حیثیت رکھتی ہے ۔ وہ اس قسم کی بے حیائی اور بدنامی کے کارناموں پر کھل پڑتی ہیں کیونکہ وہ اس سے بہت زیادہ محظوظ ہوتی ہیں ۔ اور اسے اپنی فطرت کے مطابق پاتی ہیں ۔ اور وہ محبت کو شہوت کے ساتھ خلط ملط کرتی ہیں ۔ جس طرح ایک لالچی باورچی اپنے مالک کے لئے شام کا کھانا تیار کرتا ہے ۔

انہوں نے ایک حصار تیار کیا گویا وہ کسی قلعے کو گھیرے میں لینا چاہتے تھے ۔ ہر ایک نے ایک کردار ادا کرنے کا ذمہ لیا یعنی یہ کہ وہ چند دلیلیں دے گا یا وہ کچھ چالیں چلے گا ۔ انہوں نے حملے کا منصوبہ بنالیا اور یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ کیا حیلہ اختیار کیا جائے اور اس طرح سے غیر متوقع

ہلہ بولا جائے کہ یہ چلتا پھرتا قلعہ دشمن کو اپنے کمرے میں خوش آمدید کہنے پہ مجبور ہو جائے۔

کارنو دے سب سے علیحدہ رہا اور اُسے اس معاملے کی مطلق خبر نہ تھی۔

وہ اس قدر محو تھے کہ انہیں "چربی کے گولے" کے اندر آنے کی خبر نہ تھی۔ نواب نے آہستہ سے "شی" کیا تو سب کی نظریں اس کی طرف پھر گئیں۔ وہ موجود تھی۔ اچانک خاموشی اور کسی قدر گھبراہٹ نے انہیں "چربی کے گولے" سے کچھ عرصہ کوئی کلام کرنے سے روکے رکھا۔ نواب کی بیگم نے جو معاشرے کی منافقانہ روش کی دوسروں کی نسبت زیادہ عادی تھی بالآخر پوچھا: "کیا رسمِ بپتسمہ بہت دلچسپ تھی؟"

موٹی لڑکی نے جذبات کی رو میں بہتے ہوئے سب کچھ بتا دیا۔ اس نے لوگوں کے چہروں، رویے اور گرجے کی ہیئت کے متعلق باتیں کیں اور آخر میں کہا: "کبھی کبھی عبادت کر لینا بھی اچھا ہے۔"

دوپہر کے کھانے تک یہ خواتین اس کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتی رہیں تاکہ ان کے مشورے پر اس کا اعتماد بڑھے اور وہ ان کی اور زیادہ مطیع ہو جائے۔ کھانے کی میز پر انہوں نے اپنی مہم کا آغاز کیا اور

اشارہ کے متعلق ایک مبہم سی گفتگو چھیڑی - انہوں نے زمانۂ قدیم کی مثالیں دیں۔ پہلے جوڈتھ اور ہولو فیرنیز اور پھر بغیر کسی وجہ کے ٹگریس اور سیکسٹس کا ذکر کر کے قلوپطرہ کے تمام دشمن جرنیلوں کو اپنے بستر کے قریب سے گزارنے اور قید کر کے غلام بنا لینے کی مثال دی اس کے بعد انہوں نے ایک اور عجیب و غریب کہانی سنائی جو ان سرمایہ داروں کے تخیل کی پیداوار تھی - اس کہانی میں یہ بتایا گیا تھا کہ روستہ الکبرٰی کی عورتیں، ہنی بال اور اس کے ماتحت فوجی افسروں کو اپنے ساتھ سلانے کے لئے کاپوا گئیں - انہوں نے ان تمام عورتوں کی مثالیں دیں جنہیں فاتح افواج نے حاصل کیا اور جنہوں نے اپنے جسموں کو میدان جنگ، بلکہ ہتھیار اور فتحیابی کا ذریعہ بنایا - اور انہوں نے ان وحشی اور قابلِ نفرت ہستیوں کی بھی مثالیں دیں جنہیں ان عورتوں کے بہادرانہ بوس و کنار نے فاتح بنایا اور جنہوں نے ان عورتوں کی عصمت کو انتقام یا ایک محبوب مقصد کی بھینٹ چڑھایا -

انہوں نے اشاروں کنایوں سے اس انگریزی خاندان کا بھی حوالہ دیا جس نے اپنی لڑکی کو متعدی بیماری کا ٹیکہ لگوایا تھا کہ وہ یہ بیماری نپولین کو لگا دے - مگر نپولین اچانک بیمار ہو جانے کی وجہ سے اس مہلک ملاقات سے بچ گیا -

یہ سب کچھ بڑے خوشگوار اور معتدل انداز سے بیان کیا گیا اور

ترغیب دلانے کے لئے کم مجرشی کا بھی اظہار کیا گیا۔

اس کے بعد انسان یہ یقین کر سکتا تھا کہ عورت کا فرض صرف یہی ہے کہ اپنی ذات کی قربانی دے اور فوجیوں کی بے تکی خواہشات کی تسکین کے لئے اپنے کو مسلسل سپرد کرتی رہے۔

دورا ہیا ئیں خیالات میں اس قدر غرق تھیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سُن نہیں رہی تھیں۔ "چربی کے گولے" نے کوئی بات نہ کی۔ سہ پہر سے شام تک انہوں نے اسے سوچنے دیا۔ لیکن بجائے اسے مادام کہنے کے جیسا کہ وہ اب تک اسے کہتے آئے تھے۔ اُسے صرف "میموزیل" (مس) کہنا شروع کیا، انہیں اسکی پوری طرح وجہ بھی معلوم نہ تھی۔ شاید وہ اس کے مرتبہ میں ایک درجہ کم کرنا چاہتے تھے اور اُسے اپنی شرمناک حیثیت کا احساس دلانا چاہتے تھے۔

جب شام کا کھانا چنا گیا تو موسیو فولنوی اپنا وہی پرانا فقرہ لئے آدھمکا: "جرمن افسر نے مجھے یہ پوچھنے کا حکم دیا ہے کہ کیا میموزیل الزبتھ روسے نے ابھی تک اپنا ارادہ بدلا ہے"

"چربی کے گولے" نے خشک لہجے میں "نہیں جناب" کہا۔

ڈنر (DINNER) کے موقع پر اتحاد کمزور ہو گیا۔ لوازو نے تین ناخوشگوار فقرے چست کئے۔ ہر ایک نے نئی مثالیں دینے کیلئے دماغ

پرزور دیا مگر بے سود۔ نواب کی بیگم نے بڑی راہبہ سے عیسائی درویشوں کی زندگی کے عظیم کارنامے بیان کرنے کو کہا شاید وہ اسطرح سے مذہب کو نذر۔ خراجِ عقیدت پیش کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس نے یہ بات پہلے سے نہیں سوچی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان بزرگوں کے بہت سے افعال عام نقطۂ نظر سے جرم سمجھے جائیں گے لیکن کلیسا نے بخوشی ان جرائم کو نظر انداز کر دیا کیونکہ وہ خدا کے نام کی عظمت کے لیئے یا سب کی بھلائی کے لیئے کیئے گئے تھے۔ یہ ایک قوی دلیل تھی اور نواب کی بیگم نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ خواہ اس کی وجہ پوشیدہ منافقت ہو یا در پردہ رضامندی جس میں مذہب کا لبادہ اوڑھنے والے کمال رکھتے ہیں، یا یہ محض کا نا آمد ناسمجھی یا مفید حماقت کی بنا پہ ہو مگر یہ حقیقت ہے۔ کہ اس مذہبی بہن نے اس سازش کو ناقابلِ تسخیر مدد بہم پہنچائی۔ وہ اُسے بزدل سمجھتے تھے مگر اس نے نہ صرف حوصلہ مندی اور لفاظی بلکہ تشدد کا بھی مظاہرہ کیا۔ وہ مفتیٔ شرح کے طولِ کلام سے پریشان نہ ہوتی تھی۔ اس کا دین لوہے کی سلاخ کی طرح مضبوط تھا۔ اس کا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوتا تھا۔ اس کا ضمیر اُسے کبھی ملامت نہیں کرتا تھا۔ اُسے ابراہیم علیہ السلام کی قربانی بالکل ایک سادہ حقیقت معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ بھی اُوپر سے حکم ملنے پہ اپنے باپ یا اپنی ماں کو قتل کر سکتی تھی۔

اس کی رائے کے مطابق خدا کو کوئی عمل بھی ناراض نہیں کر سکتا۔ بشرطیکہ وہ نیک نیتی سے کیا جائے۔ نواب کی بیگم نے اپنے اس نادان شریک جرم کی مذہبی حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی گفتگو کے ساتھ یسوعی فرقہ کا یہ مقولہ شامل کر دیا کہ وقتِ ضرورت ہر قسم کے ذرائع استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اور اس کے بعد اس راہبہ سے پوچھا "میری بہن! کیا آپ کے خیال میں خدا نیت کو قبول کر لیتا ہے اور عمل کو معاف کر دیتا ہے جبکہ محرک فعل اخلاص ہو؟"

"مادام! کون اس میں شک لا سکتا ہے؟ اچھے خیال سے سرزد ہونے والا برا کام بھی قابل قدر ہو جاتا ہے"

اور اسی طرح وہ رضائے خداوندی کا انکشاف کرتے رہے وہ اس کے فیصلوں کو قبل از وقت دیکھ رہے تھے اور ان چیزوں میں دلچسپی لے رہے تھے جنہیں وہ عام حالات میں کبھی درخورِ اعتنا بھی نہ سمجھتے۔ یہ سب کچھ بچ بچ کر، سلیقہ اور ہوشیاری کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔ مگر اس خدا رسیدہ راہبہ بہن کا ہر ایک لفظ نالائق آوارہ لڑکی کی مزاحمت کو توڑنے میں مدد دے رہا تھا۔ پھر گفتگو قدرے بدل گئی۔ راہبہ نے اپنے رفقائے کار کا ذکر کیا، اس نے اپنے سے اعلیٰ رتبہ کی راہبہ اور اپنے اور اپنی ہمسایہ راہبہ سینٹ نیسفور کے متعلق گفتگو کی۔ یہ دو راہبائیں شہر آور کے ہسپتالوں میں سینکڑوں

چیچک زدہ سپاہیوں کی خبر گیری کے لئے بلائی گئیں تھیں ۔ اُنہوں نے اِن مصیبت زدہ انسانوں کا نقشہ کھینچا اور ان کے مرض کی تفصیلات بیان کیں ۔ اور اگر وہ اس جرمن افسر ناقابل فہم خواہش کی بنا پر راستے ہی میں رُکی رہیں تو بہت سے فرانسیسی جنہیں وہ بچا سکتی تھیں مر جائیں گے ۔ بڑی راہبہ کریمیا، اٹلی اور آسٹریا میں رہ چکی تھی اور اپنی مہموں کا ذکر کرتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو ایسی مذہبی امداد ظاہر کیا جو فوجوں کے ساتھ ساتھ رہتی ہے اور گھمسان کے ران میں زخمیوں کو اٹھاتی ہے اور ایک لفظ سے غیر منظم نئے بھرتی کئے گئے سپاہیوں کے گروہوں کو افسروں سے بہتر طریق پر مطیع بنا لیتی ہے ۔ وہ طبل جنگ بجانے والوں کی حقیقی اور اچھی بہن تھی جس کا بگڑا ہوا چہرہ جس پر زخموں کے بے شمار نشان تھے جنگ کی تباہیوں کی تصویر معلوم ہوتا تھا اس کے بعد کوئی بھی کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ اس کی باتوں کا بہت ہی اچھا اثر ہوا تھا ۔

جونہی کھانا ختم ہوا وہ صبح دیر سے نکلنے کے ارادے سے فوراً اپنے کمروں میں چلے گئے ۔

دوپہر کا کھانا خاموشی سے کھایا گیا ۔ انہوں نے بیج کو پھلنے پھولنے اور پھل لانے کا وقفہ دیا ۔ نواب کی بیگم نے سہ پہر کو چہل قدمی کرنے کی تجویز پیش کی ۔ مائی بہ کرم نواب جیسی کے "گولہ" کے بازو میں بازو ڈال کر سب کے پیچھے چل رہا تھا ۔ وہ اس سے بے تکلف پدرانہ انداز میں باتیں کرتا جاتا تھا

اس انداز میں قدرے ناراضگی بھی تھی جیسے لڑکیوں کو ملازم رکھنے والوں کے انداز میں ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے بلند سماجی مقام اور عزت و جاہ کا احساس دلاتے ہوئے اُسے "میری بچی" کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ فوراً ہی اس نے مقصد کی بات کر دی "کیا تم ہمارے اور خود اپنے یہاں رہنے اور بعد از شکست سختیاں جھیلنے کو اس آمادگی پر ترجیح دیتی ہو جس کا تم زندگی میں بارہا اعادہ کر چکی ہو۔"

"چربی کے گولے" نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے اُسے ملامت، دلائل اور جذبات سے قائل کرنے کی کوشش کی۔ وہ محبت جتلانے، ستائش کرنے، خود کو قابل محبت ثابت کرنے کے بعد بھی نوابی شان قائم رکھنا جانتا تھا۔ اس نے اس خدمت کی تعظیم جو وہ اُن کے لئے سرانجام دے سکتی تھی اور ان کی احسانمندی کا ذکر کیا۔ اور پھر دفعتہً اس سے بے تکلف ہو کر چہک کر بولا "میری جان وہ افسر بھی فخر کرے گا کہ وہ ایسی خوبصورت لڑکی سے لطف اندوز ہوا جس کی مثال اس کے اپنے ملک میں مشکل ہی سے ملے گی"

"چربی کا گولہ" بغیر کوئی جواب دیئے باقی لوگوں کے ساتھ جا شامل ہوئی۔ جب وہ سرائے میں واپس پہنچے تو وہ اسی وقت اپنے کمرے میں چلی گئی اور پھر نظر نہ آئی۔ سب انتہائی طور پر پریشان ہو گئے۔ اب کیا

ہو گا ؟ اگر وہ اسی طرح سے اڑی رہی تو سخت مصیبت کا سامنا ہو گا۔

رات کے کھانے کا وقت آ پہنچا۔ انہوں نے انتظار کیا۔ مگر بے سود۔ آخر موسیو فولنوی نے آکر بتایا میموزیل روسے کی طبیعت ناساز ہے اس لئے وہ شریک طعام نہ ہو سکیں گی نواب نے سرائے کے منتظم کے قریب جا کر اس سے آہستہ سے پوچھا "کیا وہ (جرمن) اندر ہے ؟"

"ہاں"

اس نے اپنی سہولت کے پیش نظر اپنے ساتھیوں کو زبان سے کچھ نہیں بتلایا مگر سر ہلا کر ہلکا سا اشارہ کر دیا۔ ہر ایک نے اطمینان کا سانس لیا اور سب کے چہروں پر رونق آ گئی۔ لوازو پکار اٹھا: "مقدس کرسٹوفر! (مشہور مذہبی رہنما جو مسافروں اور شکار کھیلنے والوں کے پیرومرشد اور رہنما ہیں) میں سب کو شمپیئن پلاؤں گا۔ بشرطیکہ اس جگہ مل سکے۔ جب مادام لوازو نے مہتمم کو شراب کی چار بوتلیں لے کر آتے ہوئے دیکھا تو اسے سخت تکلیف ہوئی۔

ہر ایک خوشی سے بول رہا تھا۔ ان کے دل مسرت سے لبریز ہو گئے۔ دفعتہً نواب کو مادام لامادوں کی دلکشی کا احساس ہوا اور صنعتکار نواب کی بیگم کی ستائش کرنے لگا۔ گفتگو میں زندگی، بشاشت، نکتہ آفرینی

پیدا ہو گئی۔

اچانک لوازو نے جس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ فکر مند ہے ہاتھ اٹھا کر "خاموش رہیے" کہا۔ ہر ایک خاموش، حیران اور خوفزدہ ہو گیا۔ پھر اس نے غور سے کچھ سنا اور "شی" کہا وہ اپنے ہاتھ چھت کی سمت اٹھائے سنتا رہا اور پھر سب معمول انداز میں بولا "ٹھیک ہے۔ سب معاملہ ٹھیک"

پہلے تو وہ سمجھنے سے قاصر رہے۔ مگر جلد ہی سب ہنس پڑے۔ پندرہ منٹ بعد اس نے پھر یہی ڈھونگ رچایا اور شام تک وقتاً فوقتاً بعینہ اسی طرح کرتا رہا۔ وہ جھوٹ موٹ کسی کو بالائی منزل سے بلا کر وہ نصیحت کرتا تھا جو اس کے کاروباری دماغ کی پیداوار ہوتی تھی۔ کبھی وہ غمگین صورت بنا کر آہستہ سے "بیچاری لڑکی!" کہتا۔ کبھی وہ غصے کا اظہار کر کے "ہوں! وہ جرمن بدمعاش" کہتا۔ پھر وہ سب کو فارغ الذہن دیکھکر کہتا۔ "کافی ہے، بس کافی ہے" اور ساتھ ہی اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتا! "کاش ہم اُسے دوبارہ دیکھ سکتے۔ کہیں وہ بیچاری کو مار ہی نہ دے"

اگرچہ یہ مذاق بد ذوقی پہ مبنی تھے مگر ہر ایک انہیں سن کر خوش ہوتا تھا اور کسی شخص کو بھی ان سے تکلیف نہ پہنچتی تھی کیونکہ ناراضگی بھی

دیگر اشیاء کی طرح اپنے ماحول پر منحصر ہوتی ہے اور جو ماحول ان کے گرد و پیش رفتہ رفتہ پیدا کیا گیا تھا اسمیں جنسی خیالات کی آمیزش تھی۔

نُقل کے وقت خود عورتوں نے نازک اور سلجھے ہوئے انداز میں اشارے کئے۔ ان کی آنکھوں میں چمک تھی کیونکہ وہ بہت پی گئی تھیں۔ نواب جو بہک جاتے کے باوجود سنجیدگی قائم رکھ سکتا تھا قطب شمالی پہ موسم سرما بسر کرنے والوں کے احساسات اور تباہ شدہ جہاز کے مسافروں کے اچانک جنوب کی طرف راہ ڈھونڈ لینے پر خوشی میں تقابل کر رہا تھا۔ لوگ اس تقابل سے بہت محفوظ ہوئے۔

لوازو اچانک شمپئین کا جام ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہا۔ "میں ہم سب کی نجات کی خوشی میں پیتا ہوں" ہر شخص کھڑا ہو گیا اور سب مل کر چلانے لگے۔ یہاں تک دو مذہبی بہنیں بھی شراب کی جھاگ کو اپنے لبوں سے چھونے پر رضامند ہو گئیں حالانکہ انہوں نے اس سے پیشتر کبھی شراب نہ چکھی تھی۔ انہوں نے کہا کہ یہ لیمن سوڈا کا ذائقہ رکھتی ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ نفیس ہے۔

لوازو نے پیانو نہ ہونے پر افسوس کیا کیونکہ وہ موسیقی سے لطف اندوز نہ ہو سکتے تھے۔

کارنودے نہ کوئی بات کی اور نہ ہی کوئی اشارہ کیا وہ گہرے

خیالات میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا تھا اور کبھی کبھی اس زور سے ہلتا تھا کہ اس کی داڑھی اس کے چہرے سے راہِ فرار ڈھونڈتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ جب وہ سب آدھی رات کے وقت اپنے اپنے کمروں میں جانے کے لئے رخصت ہو رہے تھے تو لوازو نے اس کے پیٹ کو چھوتے ہوئے کہا "تم آج رات ہنسی مذاق نہیں کر رہے۔ تم نے کوئی بات نہیں کی ہے۔" اس پر کارنودے نے یکایک اپنا سر اٹھا کر سب کی طرف خشم آلود نظروں سے دیکھا اور کہا:

"میں تمہیں بتا دوں کہ تم سب نے بدکاری کے جرم کا ارتکاب کیا ہے"

وہ اٹھ کر دروازے کی طرف گیا اور پھر یہی دہرا کر کہا: "میں کہتا ہوں۔ بدکاری" اور سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس سے پہلے تو سب پر اوس پڑ گئی۔ لوازو سراسیمہ اور بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔ مگر جلد ہی حواس درست کر کے ہنسی سے بل کھاتے ہوئے بولا: "انگور کھٹے ہیں۔ انگور کھٹے ہیں۔" چونکہ اس کی بات کوئی نہ سمجھا اس لئے اس نے برآمدے کا راز منکشف کیا۔ جسے سن کر سب از سرِ نو خوش ہو گئے۔ خواتین دیوانہ وار خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ نواب اور موسیو کاغے لامادوں کی آنکھوں میں ہنستے ہنستے آنسو آ گئے۔ انہیں اس واقع کا یقین نہیں آتا تھا۔

"کیسے ہوا؟ کیا تمہیں یقین ہے؟ وہ چاہتا تھا کہ......"

"میں آپ سے کہتا ہوں کہ میں نے اسے خود دیکھا ہے "

" اور وہ انکار کرتی تھی "

" کیونکہ جرمن ساتھ والے کمرے میں موجود تھا "

" ناممکن "

" میں قسمیہ کہتا ہوں "

نواب کا ہنستے ہنستے دم اکھڑ گیا۔ صنعتکار نے دونوں ہاتھوں سے اپنی پسلیاں تھام لیں۔ لوازو نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا :

" اب آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ آج شام اُسے کیوں کوئی مذاق نہیں سوجھتا تھا۔ " اور وہ تینوں باہر چلے گئے۔

سب ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ جب کینہ پرور مادام لوازو سونے لگی تو اس نے اپنے خاوند سے کہا کہ وہ سٹریل چھوٹا سا کاعنے لاما دول حسد کی وجہ سے زرد ہو رہا تھا۔ تم جانتے ہی ہو۔ کہ کچھ عورتیں وردی پر مرتی ہیں۔ خواہ وردی والا جرمن ہو یا فرانسیسی اُن کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آہ ! کتنے افسوس کی بات ہے ! "

رات بھر برآمدے میں مدھم سا شور، سرگوشیاں، ننگے پاؤں چلنے کی آواز اور کھٹ کھٹ سنائی دیتی رہی۔ وہ رات کو دیر

تک جاگتے رہے کیونکہ دروازوں کے نیچے سے روشنی کی دھاریاں سی نظر آرہی تھیں۔ شمپئین اپنا اثر دکھلا رہی تھی۔ کہتے ہیں یہ نیند میں خلل پیدا کرتی ہے۔

دوسرے دن مطلع صاف تھا اور برف سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ گاڑی پہلے ہی تیار کھڑی مسافروں کی منتظر تھی۔ سفید کبوتروں کا جھنڈ چھ گھوڑوں کی ٹانگوں کے اردگرد بکھرے ہوئے گوبر میں اپنا رزق تلاش کر رہا تھا۔ ان کے جسم پر گھنے پر تھے اور آنکھیں گلابی تھیں جن کے مرکز میں سیاہ تل تھا۔

ڈرائیور بکری کی کھال کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔ اور اس کی نشست کے نیچے اس کا پائپ جل رہا تھا۔ خوش و خرم مسافر جلدی جلدی سفر کے لئے زادِ راہ تیار کر رہے تھے۔ انہیں صرف "چربی کے گولے" کا انتظار تھا۔ آخر وہ بھی آ ہی گئی۔

وہ قدرے پریشان اور شرمندہ دکھائی دیتی تھی۔ وہ ڈرے ہوئے انداز میں اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھی مگر سب نے ایک ساتھ اسکی طرف سے یوں منہ پھیر لیا جیسے انہوں نے اُسے دیکھا ہی نہیں تھا نواب سنے بڑے وقار سے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اس ملوث کرنے والے رابطے سے بچا لیا۔

موٹی لڑکی سراسیمہ ہو کر رُک گئی ۔ مگر پھر حوصلہ کر کے صنعتکار کی بیوی کے پاس گئی اور آہستہ سے "سلام ۔ مادام" کہا ۔ اس خاتون نے تھوڑا سا سر جھکا کر یوں دیکھا جیسے اس کی عصمت پہ حملہ کیا گیا ہو۔ ہر شخص نے اپنے آپ کو مصروف ظاہر کیا اور وہ سب اس سے یوں دُور دُور رہتے تھے جیسے اس کے فراک میں کوئی متعدی بیماری چھپی ہوئی ہے ۔ پھر وہ تیزی سے گاڑی کے اندر داخل ہو گئے ۔ وہ سب سے آخر میں سوار ہوئی اور تنہا اِسی نشست پر جا بیٹھی جس پر وہ سفر کی ابتدا میں بیٹھی تھی ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے نہ تو وہ جانتے ہیں اور نہ ہی وہ اسکو دیکھ رہے ہیں ۔ مادام لوازو نے دُور سے اُسے دیکھتے ہوئے اپنے خاوند سے دبی زبان سے کہا: "خوش قسمتی سے مجھے اس کے پاس بیٹھنا نہیں پڑا"

گاڑی چلنے لگی اور سفر شروع ہوا ۔ کسی نے کوئی بات نہ کی ۔ "چربی کے گولے" میں اتنی جرأت بھی نہ تھی کہ آنکھیں اٹھا کر دیکھ سکے ۔ اُسے اپنے ساتھیوں پر غصہ آ رہا تھا ۔ اور ساتھ ساتھ ہی اُسے خود کو اس جرمن افسر کے گندے بوسوں کے سپرد کرنے پہ خفت محسوس ہو رہی تھی جس کی آغوش میں ان لوگوں کی ریاکاری نے اُسے پھینک دیا تھا نواب کی بیگم نے مہرِ سکوت توڑتے ہوئے مادام کا غنے لاما دن

سے کہا: "کیا آپ مادام اتریل کو جانتی ہیں؟"

"ہاں، وہ میری سہیلی ہے"

"وہ کتنی دلکش ہے!"

"مسرور کن! وہ سلیم الطبع اور تعلیم یافتہ عورت ہے۔ پھر وہ فنونِ لطیفہ کی دلدادہ ہے۔ وہ نہایت اچھا گاتی ہے۔ اور نقاشی میں تو اُسے کمال حاصل ہے"

صنعتکار نواب کے ساتھ باتیں کر رہا تھا اور گاڑی کے شیشوں کی کھڑکھڑاہٹ میں کبھی کبھی کوپن، پریمیم، میعاد۔ وغیرہ الفاظ بھی سنائی دیتے تھے۔

لوازو نے اپنی بیوی سے تاش کھیلنے میں مصروف ہو گیا۔ یہ تاش وہ سرائے سے چرا لایا تھا اور یہ پانچ سال تک سرائے کے گندے میز پر کھیلی گئی تھی اور اس پر جا بجا چکناہٹ کے داغ تھے۔

نیک راہباؤں نے اپنی پیٹیوں سے لٹکی ہوئی مالائیں پکڑ لیں۔ ہاتھوں سے صلیب کا نشان بنایا اور ہونٹوں کو جنبش دینے لگیں گویا وہ ساری عبادت وریاضت یہیں ختم کر دیں گی وقتاً فوقتاً وہ ایک تمغے کو بوسہ دیتی تھیں اور از سرِ نو صلیب کا نشان بناتی تھیں اور اپنی بڑبڑاہٹ شروع کر دیتی تھیں جو تیز اور مسلسل ہوتی تھی۔

کارنودے بت بنا بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

تین گھنٹے کے بعد لوازو نے تاش رکھتے ہوئے کہا: "مجھے بھوک لگ رہی ہے"۔ اس کی بیوی نے ایک لفافے سے گوشت نکالا اور اُس کے باریک قتلے بنائے اور دونوں نے کھانا شروع کیا۔

نواب کی بیگم نے کہا: "ہم بھی یہی کریں"

دونوں کے اتفاق رائے سے بیگم نے دو جوڑوں کے لئے تیار کیا گیا۔ کھانا نکالا۔ یہ کھانا ان طشتریوں میں تھا جن کے ڈھکنوں کے مزین نشانات ان کے اندر رکھی ہوئی اشیاء کی علامت ہوتے ہیں سؤر کا گوشت تھا جس میں دیگر اقسام کے گوشت کی آمیزش تھی۔ ایک مربع شکل کا پنیر کا بڑا سا ٹکڑا اخبار میں لپٹا ہوا تھا۔ جس کی طشتری کے اُوپر مختلف اشیاء لکھا ہوا تھا۔

دو نیک راہباؤں نے گوشت کا قورمہ نکالا جس میں سے لہسن کی بُو آرہی تھی۔ کارنودے نے اپنے اوورکوٹ کی جیبوں میں سے چار انڈے اور روٹی کا ٹکڑا نکالا۔ اس نے انڈوں کے چھلکے اپنے پاؤں کے قریب پھینک دیئے اور کھانا شروع کیا۔ زردی کے ٹکڑے اسکی داڑھی میں اٹکے ہوئے ستارے معلوم ہوتے تھے۔

"چربی کا گولا" جلدی اور گھبراہٹ کی وجہ سے کچھ نہ لا سکی تھی

اور وہ ان اطمینان کے ساتھ کھانے والوں کو غم و غصے سے دیکھ رہی تھی پہلے تو اُسے اس قدر شدید طیش آیا کہ اس نے چیخنے کے لئے اپنا منہ کھولا تاکہ ان پر لعنت و ملامت کی بوچھاڑ کرے۔ مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اِسکے غصّے نے اس کا اپنا گلا ہی دبا دیا۔

نہ کوئی اس کی طرف دیکھتا تھا اور نہ کوئی اس کے متعلق سوچتا تھا اس نے اپنے آپ کو ان دیانتدار بدمعاشوں کی نفرت میں ڈوبا ہوا پایا جنہوں نے پہلے تو اُسے اپنے مقصد کی بھینٹ چڑھایا اور پھر ناکارہ چیز سمجھ کر رد کر دیا۔ اس نے اپنی اچھی اچھی اشیا سے بھری ہوئی ٹوکری کا خیال کیا جسے وہ ندیدوں کی طرح چٹ کر گئے تھے۔ اس نے اپنے دو چوزوں، سموسوں، ناشپاتیوں اور شراب کی چار بوتلوں کے متعلق سوچا۔ اس کا غصہ ضرورت سے زیادہ کسی ہوئی رسی کی طرح ٹوٹ گیا اور اس نے محسوس کیا کہ وہ رو پڑنے کو تیار ہے۔ اِس نے رونے سے باز رہنے کی انتہائی کوشش کی۔ اس نے منہ بنا کر بچوں کی طرح سسکیاں روکیں۔ لیکن آنسو نکل کر اس کے گوشہ ہائے چشم میں چمکنے لگے اور جو آنسو چٹان سے نکلنے والی کی طرح ڈھلک کر اس کے سینے پر آ گرے۔ وہ سیدھی بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں مرکوز تھیں اور چہرہ زرد اور درشت تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ کوئی بھی اس کی

طرف نہیں دیکھے گا۔ لیکن نواب کی بیگم نے اُسے دیکھ لیا اور اشارے سے اپنے خاوند کو بتلایا۔ اس نے لاپرواہی سے اپنے شانوں کو ہلایا جس کا مقصد تھا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔

مادام لوازو نے فتحمندانہ طور پر ہنس کر آہستہ سے کہا "وہ شرم سے رو رہی ہے" دو نیک راہباؤں نے اپنا قورمہ کاغذ میں لپیٹ کر پھر سے عبادت شروع کر دی۔

کارنودے نے جو اپنے انڈے ہضم کر رہا تھا اگلی نشست پر ٹانگیں پھیلا دیں اور بازو پہ بازو رکھ کر اس آدمی کی طرح مسکرانے لگا جو کوئی سوانگ دیکھ رہا ہو۔ اس نے سیٹی بجا کر فرانس کا قومی ترانہ گانا شروع کیا۔ چہروں پر رنج کے بادل چھا گئے۔ اس کے ساتھیوں نے یہ ہر دل عزیز گانا پسند نہ کیا۔ ان پر اعصابی کیفیت اور ہیجان کا عالم طاری ہو گیا۔ انہیں دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ان کتوں کی طرح غُرّانا چاہتے ہیں۔ جن کے سامنے وحشیوں کا باجا بجایا جاتا ہے۔ اس نے ان کے جذبات کو بھانپ لینے کے باوجود اپنا شغل ختم نہیں کیا۔ کبھی وہ یہ الفاظ بولتا تھا:

اے وطن کی مقدس محبت

انتقام لینے والے بازوؤں کی مدد کر

آزادی، پیاری آزادی
اپنے محافظوں کے ساتھ مل کر جنگ کر۔

چونکہ برف سخت ہو گئی تھی۔ اس لئے وہ تیزی سے سفر کر رہے تھے۔ وہ شہر ذی ایپ تک سفر کی طویل اور اداس ساعتوں میں، سڑک کے ہچکولوں کے ساتھ، بڑھتی ہوئی رات اور گاڑی کے اندر کی تاریکی میں، اس نے منتقمانہ سیٹی وحشیانہ ضد کے ساتھ جاری رکھی اور اپنے ساتھیوں کو گانا سننے پر مجبور کیا۔

اور "چربی کا گولہ" لگاتار روتی رہی۔ کبھی کبھی ایک آدھ سسکی کی آواز جسے وہ روک نہ سکتی تھی۔ مسافروں کی دو قطاروں کے درمیان تاریکی میں گونج پیدا کرتی تھی۔

بحران

آگ خوب جل رہی تھی اور دو شخصوں کے لئے چائے کی میز بچھی ہوئی تھی۔ کونٹ دو سالیور نے اپنا ہیٹ، دستانے اور پوستین کا کوٹ کرسی پر پھینکا۔ اس کی بیگم اپنا اوپر والا کوٹ اتار کر آئینہ میں اپنا عکس دیکھکر مسکراتی ہوئی ہیروں بھری انگلیوں سے چند بکھری ہوئی زلفیں سنوار رہی تھی۔ اس کا خاوند اُسے چند لمحوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سے کچھ کہنے ہی والا تھا۔ مگر وہ ہچکچا رہا تھا آخر اس نے کہا:-

"آج شام تم نے آنکھیں لڑا کر غضب ڈھایا ہے"

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فتحمندانہ انداز میں مسکرائی۔

"یقیناً" اس نے جواب دیا اور وہ بیٹھ گئی اور چائے بنائی اس کا خاوند بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"اس سے میری حالت مضحکہ خیز ہو گئی"

"کیا کوئی لے دے کا ارادہ ہے؟ کیا تم میرے طرزِ عمل پر تنقید کرنا چاہتے ہو؟" اس نے اپنے ابروں کو خم دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میرا کہنے کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ موسیو بیورل بہت غیر مناسب طریقے پر تمہاری طرف متوجہ تھا۔ اور مجھے یہ حق ہوتا کہ ——— تو میں یہ کبھی بھی برداشت نہ کرتا۔"

"کیوں؟ میرے پیارے! تمہیں کیا ہو گیا؟ کیا پچھلے سال سے تم نے اپنے خیالات بدل لئے؟ ابھی ایک سال ہی ہوا کہ تمہیں اس کی مطلق پرواہ نہ تھی کہ کون مجھ سے عشق لڑاتا ہے اور کون نہیں لڑاتا۔ جب مجھے اس کا علم ہو گیا تھا کہ تمہاری ایک محبوبہ جسے تم دیوانہ وار چاہتے ہو اور میں نے تمہیں اس بات کا احساس دلایا تھا کہ تم مادام دوسری کے ساتھ معاشقہ کر کے مجھے دکھ پہنچا رہے ہو اور سب کی نظروں میں میں مضحکہ خیز معلوم ہو رہی ہوں ——— بالکل ویسے ہی جیسے آج رات تم نے محسوس کیا ہے۔ جانتے ہو تم نے مجھے اس وقت کیا جواب دیا تھا؟ یہی کہ میں بھی مکمل طور پر آزاد ہوں اور یہ کہ شادی دو سمجھدار اشخاص کے درمیان محض شراکت ہے۔ اور یہ محض سماجی بندھن ہے۔ کوئی اخلاقی بندھن نہیں

کیا یہ درست نہیں ؟ تم نے مجھے یہ بھی احساس دلایا تھا کہ تمہاری محبوبہ مجھ سے کہیں زیادہ دلکش ہے - اور اس میں زیادہ نسوانیت ہے - بے شک تم نے یہ سب کچھ بڑے عمدہ طریقے سے کہا تھا اور میں تسلیم کرتی ہوں کہ تم میرے جذبات کا احترام کرنے کی انتہائی کوشش کی تھی جس کے لئے میں تمہاری شکر گزار ہوں - لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میں تمہارے مطلب کو خوب سمجھتی تھی -

پھر ہم نے ایک دوسرے سے عملی طور پر علیحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا - اگرچہ ہم ایک ہی مکان میں رہتے تھے مگر ایک دوسرے کے قریب نہ پھٹکتے تھے - ہمارا ایک بچہ بھی تھا - اور دنیا کے سامنے بھرم رکھنا بھی ضروری تھا - مگر تم نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اگر میں چاہوں تو کوئی عاشق بھی ڈھونڈ سکتی ہوں - بشرطیکہ اس کی کسی کو خبر نہ ہو - بلکہ اس معاملے میں عورتوں کی چالاکی پر تم نے ایک لمبی چوڑی اور دلچسپ تقریر بھی کی تھی کہ عورتیں کس عمدگی سے اس کام کو نبھاتی ہیں وغیرہ وغیرہ - میرے پیارے میں سب کچھ پوری طرح سمجھتی ہوں - اس وقت تم مادام دوسری سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے - اور میری قانونی اور عروسی محبت تمہاری خوشی میں حائل ہوتی تھی - لیکن اس وقت سے اب تک ہم بہترین طریقے پر زندگی بسر کرتے رہے ہیں - اگرچہ ہم سوسائٹی میں اکٹھے جاتے ہیں مگر اپنے گھر میں ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں - لیکن گذشتہ دو ایک ماہ سے تم نے حاسدانہ طرزِ عمل اختیار کیا ہے اور میں اسے سمجھنے سے قاصر ہوں "

"پیاری میں حاسد نہیں - مگر تم اس قدر کم عمر اور جذباتی ہو کہ مجھے ڈر ہے۔ کہیں سب دنیا کی انگلیاں تمہاری طرف نہ اٹھیں - "

"تم مجھے ہنسنے پر مجبور کرتے ہو۔ تمہارا طرزِ عمل نشترِ تحقیق کی تاب نہیں لا سکتا۔ تم جس پر عمل نہیں کرتے اس کے متعلق وعظ بھی نہ کیا کرو - "

"بھلا ہنسو نہیں - یہ ہنسی کی بات نہیں ہے - میں ایک سچے دوست کی طرح باتیں کر رہا ہوں - جہاں تک تمہاری باتوں کا تعلق ہے ان میں بے حد مبالغہ ہے - "

"ہرگز نہیں - جب تم نے مادام دوسری کی محبت کا اعتراف کیا تھا - تو میں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ تم مجھے اپنی تقلید کی اجازت دے رہے ہو - لیکن میں نے ایسا نہیں کیا - "

"مجھے اجازت دو کہ ـــــــــــ"

"میری بات نہ کاٹیئے - ہاں میں نے ایسا نہیں کیا - میرا کوئی عاشق نہیں ہے - میں تلاش میں ہوں مگر ابھی تک کوئی مناسب آدمی نہیں مل سکا وہ ضروری طور پر عمدہ ہونا چاہیے - تم سے زیادہ عمدہ ہونا چاہیئے - یہ بھی تمہاری تحسین ہے - مگر تم اس کی قدر نہیں کر سکتے "

"یہ مذاق بہت ہی ناگوار ہے "

"میں بالکل مذاق نہیں کر رہی - میں نہایت سنجیدگی سے بات کر رہی

ہوں جو کچھ تم نے مجھے گذشتہ سال کہا تھا مجھے حرف بہ حرف یاد ہے - میں ایک لفظ بھی فراموش نہیں کر سکی - اور جب میرا دل چاہے گا تمہاری باتوں اور تمہارے طرزِ عمل کی پرواہ کئے بغیر اپنا عاشق رکھ لوں گا - اور تمہیں شبہ تک نہ ہو سکیگا - تم بہت سے دوسرے مردوں کی طرح بے خبر ہی رہو گے۔"

"تم ایسی باتیں کیوں کرتی ہو ؟"

"میں ایسی باتیں کیوں کرتی ہوں ؟ جب مادام گرس نے بیچارے شبہ نہ کرنے والے موسیو دوسروی کے متعلق مذاق کیا تھا تو سب سے پہلے تم ہنسے تھے "

" ہو سکتا ہے - مگر یہ الفاظ تمہیں زیب نہیں دیتے "

" خوب ! جب موسیو دوسروی مذاق کا نشانہ بنے تو مذاق تمہارے خیال میں اچھا ہے - مگر جب تم اس مذاق کا نشانہ بنو تو پھر تمہیں یہ مذاق مناسب معلوم نہیں ہوتا - مرد بھی عجیب ہوتے ہیں ! بہر حال میں ان چیزوں کی خواہش مند نہیں - میں تو صرف دیکھنا چاہتی تھی کہ تم اس بات کے لئے تیار بھی ہو، کہ نہیں - "

" تیار ؟ کس بات کے لئے تیار "

" دھوکا دیئے جانے کے لئے - جب آدمی اس قسم کی باتیں سن کر ناراض ہو جائے تو وہ تیار نہیں ہوتا - میں شرط لگاتی ہوں - کہ دو مہینوں

کے اندر اندر اگر میں تمہیں کسی فریب خوردہ خاوند کے متعلق بتلاؤں تو تم سب سے پہلے ہنسو گے۔ اور جب وہ فریب خوردہ خاوند خود تم ہی ہو تو یہ ایک عام بات ہو گی"

"بخدا تم آج رات گستاخ ہو۔ اور میں نے اس طرح پہلے کبھی نہیں دیکھا"

"[illegible] اگر [illegible] اور بدتر ہو گئی ہوں۔ مگر قصور تمہارا ہے"

"میری جان! آؤ ہم سنجیدگی سے گفتگو کریں۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں بلکہ اس چیز کی بھیک مانگتا ہوں کہ موسیو بورل کو اپنے ساتھ اس طرح عشق نہ لڑانے دو جیسے وہ آج رات لڑا رہا تھا۔"

"تم حسد کر رہے ہو۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا"

"نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ میری ہنسی اڑائیں۔ اگر میں نے دوبارہ اس آدمی کو تمہیں گھورتے ہوئے دیکھا تو میں اسے پیس کے رکھ دوں گا۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہو؟"

"کیوں نہیں؛ مجھے یقین ہے کہ میں اس سے بھی بدتر فعل کا مرتکب ہو سکتا ہوں"

"شکریہ۔ مجھے افسوس ہے۔ میں تم سے محبت نہیں کر سکتی"

کاؤنٹ اٹھ کھڑا ہوا اور میز کے قریب سے گزرتے ہوئے بیوی کے

پیچھے سے جا کر اسکی گردن کو بوسہ دیا۔ اس نے اچھلتے ہوئے خشمگیں نگاہیں ڈال کر کہا:
"تم نے ایسا کرنے کی جرأت کیوں کی؟ یاد رکھو ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے ہم بالکل اجنبی ہیں"

"خدارا ناراض نہ ہو۔ تم اس قدر خوبصورت معلوم ہو رہی ہو کہ آج رات میں قابو میں نہ رہ سکا"

"تو پھر میں پہلے کی نسبت حیرت انگیز حد تک بہتر ہو گئی ہوں گی؟"

"تم بہت دلکش معلوم ہو رہی ہو۔ تمہارے بازو اور شانے خوبصورت ہیں اور تمہاری جلد ــــــــ"

"موسیو ہیوں دل کو اسیر کرے گی"

"تم کس قدر رنگینی ہو! لیکن میں نے تم سے زیادہ دلکش عورت نہیں دیکھی"

"تم ضرور ان دنوں روزے رکھ رہے ہو"

"کیا مطلب؟"

"میں کہتی ہوں تم گذشتہ دنوں سے ضرور روزے رکھ رہے ہو"

"تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"میرا مطلب وہی ہے جو میں کہتی ہوں۔ تم نے ضرور کچھ عرصہ روزے رکھے ہیں۔ اور اب تمہیں بھوک لگ رہی ہے۔ جب آدمی کو بھوک لگے تو وہ

چیز بھی کھا لیتا ہے جو وہ عام طور پر نہیں کھاتا۔ میں طاقِ نسیاں پہ رکھا ہوا وہ کھاتا ہوں جسے تم آج کی رات کھا لینے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھو گے"

"مارگریٹ! تمہیں یہ سب باتیں کس نے سکھا دیں؟"

"تم نے سکھائیں۔ میرے علم کے مطابق تم نے چار محبوبائیں رکھیں۔ ایکٹریس۔ سوسائٹی گرلز، بازاری عورتیں وغیرہ وغیرہ میرے ساتھ تمہاری اس اچانک محبت کی وجہ سوائے فاقہ کشی کے اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"تم مجھے گستاخ بلکہ وحشی سمجھو گی۔ مگر میں تم دوسری بار تمہاری محبت میں گرفتار ہوا ہوں۔ میں تم سے دیوانہ وار محبت کرتا ہوں"

"خوب! خوب۔ پھر تم ——— چاہتے ہو کہ ———"

"بالکل"

"آج کی رات؟"

"آہ۔ مارگرایٹ!"

"تم از سرِ نو بدنام ہو رہے ہو۔ ہمیں آہستگی سے گفتگو کرنی چاہیئے ہم اجنبی ہیں۔ کیا ایسا نہیں؟ یہ درست ہے کہ میں تمہاری بیوی ہوں مگر میں آزاد ہوں۔ میرا ارادہ تھا کہ کسی کو اپنی توجہ کا مرکز بناؤں مگر میں تمہیں کسی دوسرے پہ ترجیح دیتی ہوں۔ بشرطیکہ میری تلافی کی جائے۔"

"میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔ تمہارا مطلب کیا ہے؟"

" میں واضح تر گفتگو کرتی ہوں - کیا میں تمہاری معشوقاؤں سے زیادہ خوبصورت ہوں ؟ "

" ہزار درجہ خوبصورت "

" خوبصورت ترین سے بھی زیادہ خوبصورت ؟ "

" ہاں ہزار درجہ "

" تین مہینوں میں تم نے اس پر کیا خرچ کیا "

" آخر تمہارا مطلب کیا ہے ؟ "

" میرا مطلب ہے کہ تم نے اپنی سب سے مہنگی محبوبہ پر جو اہرات کھانے اور سیر و تفریح کی صورت میں کس قدر رقم تین مہینوں میں صرف کی ؟ "

" میں کیسے جان سکتا ہوں ؟ "

" تمہیں جاننا چاہیے - فرض کیجئے یہ رقم پانچ ہزار فرانک فی ماہ ہے کیا یہ اندازہ کسی قدر صحیح ہے ؟ "

" ہاں - تقریباً "

" تو میری جان مجھے پانچ ہزار فرانک دے دو - میں ایک مہینے کے لئے تمہاری ہو جاؤں گی - آج کی رات سے شروع کر کے "

" مارگریٹ ! پاگل ہو گئی ہو ؟

" نہیں - میں پاگل نہیں ہوں - اگرچہ کہ تم کہتے ہو - اس لئے یہ سب

کچھ کہہ رہی ہوں - اچھا - خدا حافظ ! "

بیگم اپنی خوابگاہ میں داخل ہو گئی - کمرہ خوشبو سے مہک رہا تھا۔
کاؤنٹ، دروازے میں کھڑا ہو کر کہنے لگا :

" کتنی پیاری خوشبو ہے ! "

" کیا واقعی تم ایسا خیال کرتے ہو - پور سیپائین نامی عطر استعمال کرتی ہوں - اس کے علاوہ اور کوئی عطر استعمال نہیں کرتی - "

" واقعی ؟ میں نے کبھی غور نہیں کیا - یہ بہت اچھا عطر ہے "

" ہو سکتا ہے - لیکن مہربانی فرما کر تشریف لے جائیے - میں سونا چاہتی ہوں "

" مارگریٹ ! "

" کیا آپ براہِ کرم تشریف نہیں لے جائیں گے ؟ "

" کاونٹ اندر آ کر کرسی پہ بیٹھ گیا -

بیگم نے کہا : " تم نہیں جاؤ گے کیا ؟ بہت اچھا "

اس نے آہستہ آہستہ اپنا لباس اتارا - اپنے سفید بازو اور گردن کو برہنہ کیا اور پھر اپنے بالوں کو ڈھیلا کرنے کے لئے اپنے بازوؤں کو سر کے اوپر بلند کیا - کاونٹ ایک قدم اس کی جانب بڑھا۔

" میرے قریب مت آؤ - ورنہ میں واقعی ناراض ہو جاؤں گی -

سنتے ہو؟"

اس نے اُسے اپنے بازوؤں میں لیکر چومنے کی کوشش کی مگر بیگم نے معطر پانی کا گلاس میز پر سے اٹھا کر اس کے منہ پہ دے مارا۔ وہ بے حد ناراض ہوا اور چند قدم پیچھے ہٹ کر بولا: "کس قدر احمق ہو!"

"شاید۔ مگر تم میری شرط جانتے ہو۔ پانچ ہزار فرانک!"

"بہت بڑی زیادتی ہے"

"کیوں؟"

"کیوں! کیا کسی نے کسی کو اپنی بیوی کو خریدتے سنا ہے؟"

"آہ! تم کس قدر خوفناک حد تک گستاخ ہو!"

"میں فرض کرتا ہوں کہ میں گستاخ ہوں۔ مگر میں پھر کہوں گا کہ بیوی کو اس کی قیمت ادا کرنے کا خیال خلافِ فطرت اور خلافِ عقل ہے۔ یہ کھلی ہوئی حماقت ہے۔"

"کیا کسی بدچلن عورت کو رقم دینا اس سے بدتر نہیں ہے؟ یقیناً ایسا کرنا انتہائی حماقت ہے جبکہ گھر میں تمہاری اپنی بیوی موجود ہو۔"

"ہو سکتا ہے۔ مگر میں مضحکہ خیز بننا پسند نہیں کرتا"

بیگم نے بستر پہ بیٹھ کر اپنے موزے اتارنے شروع کئے اور اس کے گلابی پاؤں برہنہ نظر آنے لگے۔ کاؤنٹ نے کسی قدر قریب جا کر پیار بھرے

لیسے میں کہا : " مارگریٹ ! تمہارا خیال کس قدر عجیب ہے ! "

" کیسا خیال ؟ "

" مجھ سے پانچ ہزار فرانک مانگنے کا خیال "

" عجیب ؟ یہ خیال عجیب کیسے ہو سکتا ہے ؟ کیا ہم اجنبی نہیں ہیں ؟ تم کہتے ہو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے - چلو اچھا یہ بھی سہی - تم میرے ساتھ شادی نہیں کر سکتے کیونکہ میں پہلے ہی تمہاری بیوی ہوں - اس لئے تم مجھے خرید لو - میرے اللہ ! کیا تم نے دوسری عورتوں کو نہیں خریدا ؟ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ وہ رقم جو تم ایک اجنبی عورت کو ضائع کرنے کے لئے دیتے ہو مجھے دے دو ؟ دیکھو ! تمہیں یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ بیوی کو خریدنے کا خیال بالکل اچھوتا ہے ! تمہارے جیسے ذہین آدمی کو تو یہ خوش کن معلوم ہونا چاہیئے - اور حقیقت تو یہ ہے جب تک آدمی کسی چیز پہ بہت سا زر نہ خرچ کرے اس سے محبت نہیں کرتا - ایسا کرنے سے ہماری ازدواجی محبت میں تمہاری ناجائز محبت کے مقابلے میں زیادہ دلچسپی پیدا ہو جائیگی کیا میں درست نہیں کہہ رہی ؟ "

وہ گھنٹی کے قریب جا کر کہنے لگی : " اچھا جناب ! اگر آپ تشریف نہ لے گئے تو میں گھنٹی بجا کر اپنی خادمہ کو بلا لونگی " کاونٹ پریشان اور نالاض کھڑا تھا - اچانک اس نے اپنی جیب سے مٹھی بھر کر نوٹ نکالے اور بیوی کی طرف پھینک دیئے اور کہا : " یہ چھ ہزار ہیں - جادوگرنی کہیں کی - لیکن

یاد رکھو۔۔۔۔۔"

بیگم نے رقم اٹھا کر گنی اور پوچھا: "کیا؟"

"اس بات کی عادت ہرگز نہ ڈالنا"

اس نے زور سے ہنستے ہوئے کہا: "ہر مہینے پانچ ہزار فرانک دینے ہونگے ورنہ تمہیں تمہاری ایکٹرسوں کے پاس واپس بھیج دوں گی۔ اور اگر تم میرے ساتھ خوش رہو گے۔ تو اور رقم کا مطالبہ کروں گی"

اردلی

افسروں سے بھرا ہوا قبرستان پھولوں سے ڈھکے ہوئے کھیت کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ ٹوپیاں اور سُرخ پائجامے، فیتے اور طلائی تکمے فوجیوں کے کندھوں پہ لگی ہوئی علامات۔ گھوڑ سواروں کی وردیوں پہ آویزاں خوبصورت حریری رسیاں اُن قبروں کے درمیان گذر رہی تھیں۔ جن کی سیاہ اور سفید صلیبیں نعمت، وفالبوہ نسلِ مردہ پہ اپنے ماتمی بازو کشادہ کئے ہوئے تھیں —— وہ بازو جو آہن، سنگِ مرمر اور لکڑی سے بنائے گئے تھے۔

کرنل لیموسیس کی بیوی کو ابھی ابھی دفنایا گیا تھا دو روز پیشتر وہ

نہاتے ہوئے ڈوب گئی تھی۔ سب رسومِ میت ادا ہو چکی تھیں۔ پادری جا چکا تھا۔ لیکن کرنل دو افسروں کا سہارا لئے قبر کے گڑھے کے سامنے کھڑا رہا۔ وہ گڑھے کے اندر اس تابوت کو دیکھ رہا تھا جو شاہ بلوط کی لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ اور جس میں اس کی نوجوان بیوی کی لاش گل سڑ رہی تھی۔

وہ قریب قریب بوڑھا ہو چکا تھا۔ اُس کا قد لمبا، جسم دبلا اور مونچھیں سفید تھیں۔ تین سال قبل اس نے اپنے رفیق کار کرنل سورتی کی موت پر اس کی یتیم لڑکی سے شادی کر لی تھی۔

کپتان اور لفٹیننٹ جن کا سہارے لئے اُن کا افسر کھڑا تھا، اُسے وہاں سے لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر وہ اڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں جنہیں وہ بڑی بہادری سے بہنے سے روکے ہوئے تھا۔ وہ کہہ رہا تھا: "نہیں۔ نہیں۔ مجھے کچھ عرصہ اور یہاں رہنے دو"۔ وہ وہیں رہنے پر مُصر تھا۔ اس کی ٹانگیں اس قبر کی جانب خمیدہ تھیں جو اُسے اتھاہ معلوم ہوتی تھی جس کے عمق میں اس کا دل، اس کی زندگی اور اسکی عزیز ترین متاع گر گئی تھی۔

اچانک جنرل اور مول آیا اور اُس نے اسے بازو سے پکڑ کر زبردستی وہاں سے گھسیٹا اور کہا: "آؤ، آؤ میرے پرانے ساتھی تمہیں یہاں ہرگز ٹھہرنا نہیں چاہیئے"

کرنل نے اپنے افسر کا کہا مانا اور اپنی رہائش گاہ کی طرف واپس چلا گیا جونہی اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اُسے میز پر پڑا ہوا خط نظر آیا۔ جب اس نے یہ خط اٹھایا تو اس پر حیرت اور اضطراب کی وجہ سے کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ گرتے گرتے سنبھلا۔ اُس نے اپنی بیوی کا خط پہچان لیا تھا۔ خط پہ اُسی دن کی مہر اور تاریخ تھی۔ اس نے لفافہ چاک کر کے پڑھنا شروع کیا:

"آبا، مجھے ابا کہنے کی اجازت دیجئے کیونکہ میں ماضی میں آپ کو آبا ہی کہا کرتی تھی۔ یہ خط آپ کو اس وقت ملے گا۔ جب میں مر کر دفن ہو چکی ہوں گی۔ اس لئے ہو سکتا ہے۔ شاید آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کے جذبہ رحم کو بیدار کرنا یا اپنے گناہ کو کم ثابت کرنا نہیں چاہتی۔ میں اس عورت کے خلوص دل کے ساتھ جو ایک گھنٹہ کے اندر اندر خود کشی کرنے والی ہے پوری حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔

جب آپ نے ازراہِ کرم مجھ سے شادی کی اور میں نے بطور احسان مندی خود کو آپ کے سپرد کیا تو میں بچیوں کی طرح آپ سے پیار کرتی تھی۔ میں آپ سے ویسی ہی محبت کرتی تھی جیسی مجھے اپنے حقیقی آبا سے تھی۔ تقریباً اتنی ہی۔ اور ایک دن جب آپ مجھے اپنے گھٹنوں پر بٹھا کر چوم رہے تھے تو میں نے بیساختہ آپ کو آبا کہہ دیا تھا یہ دل کی فطری اور بیساختہ پکار اٹھی۔ یقیناً آپ میرے نزدیک باپ تھے اور فقط باپ۔ اور آپ ہنسکر مجھ سے کہتے تھے۔

'میری بچی، مجھے ہمیشہ اسی طرح سے مخاطب کیا کرو،'

"ہم شہر میں آئے - ابا مجھے معاف کرنا میں محبت میں گرفتار ہو گئی آہ! میں نے بہت دیر تک خود کو روکا - تقریباً دو سال تک - اور اس کے بعد میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی اور راہِ راست سے بھٹکی ہوئی عورت بن گئی

"اور جہاں تک اس کا تعلق ہے - آپ کبھی یہ معلوم نہیں کر سکیں گے کہ وہ کون شخص ہے - اس معاملے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہے کیونکہ میرے گرد و پیش اور میرے ساتھ ہمیشہ ایک درجن افسر ہوتے تھے جنہیں آپ بارہ سیّارے کہا کرتے تھے۔

"ابا اُسے جاننے کی کوشش نہ کرنا اور نہ اُس کے ساتھ نفرت کرنا۔ اس کی جگہ اگر اور کوئی آدمی ہوتا تو وہی کچھ کرتا جو اس نے کیا - مزید بر آں وہ مجھے دل و جان سے چاہتا تھا۔

" سنیئے! ایک دن ہمیں جزیرہ بیکاس میں ایک دوسرے سے ملنا تھا - آپ پل کے قریب اس چھوٹے سے جزیرے کو جانتے ہی ہونگے مجھے وہاں تیر کر پہنچنا تھا اور اُسے جھاڑیوں میں چھپ کر میرا انتظار کرنا تھا اور پھر وہاں رات گئے تک رہنا تھا تاکہ کوئی اُسے واپس جاتے ہوئے دیکھ نہ لے - میں اُسے وہاں ابھی ملی ہی تھی کہ شاخیں کھلیں اور ہم نے آپ کے اردلی فلپ کو دیکھا جو کہ ہماری تاک میں تھا - میں نے محسوس کیا کہ ہم دونوں کی تباہی

قریب ہے اور میرے منہ سے چیخ نکل گئی - یہ دیکھ کر میرے چاہنے والے نے مجھ سے کہا ــــــــ

'تم تیر کر اطمینان سے واپس چلی جاؤ اور مجھے اور اس آدمی کو یہیں رہنے دو'

" میں واپسی پر اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ ڈوبتے ڈوبتے بچی اور میں آپ کے پاس آئی تو مجھے یہی توقع تھی کہ کوئی خوفناک واقعہ پیش آئے گا -

ایک گھنٹے کے بعد فلپ مجھے ڈرائنگ روم کے باہر ملا اور آہستہ سے کہا : 'میں مادام کے احکام بجالانے پر تیار ہوں - اگر آپ مجھے کوئی خط دینا چاہیں تو حاضر ہوں' میں نے سمجھ لیا کہ آپ کے اردلی نے اپنے آپ کو بیچ دیا تھا اور میرے عاشق نے اُسے خرید لیا تھا -

" میں نے اُسے اپنے کچھ خط دیئے - وہ میرے تمام خط لے جاتا تھا اور اُن کے جواب بھی لاتا تھا - یہ سلسلہ کوئی دو مہینے تک رہا - ہمیں اس پر بھروسہ تھا - بعینہٖ جیسے آپ کو اس پہ بھروسہ تھا - "

" ابا - جو کچھ ہوا وہ یہ ہے - ایک دن جب میں تیر کر اس جزیرے پر پہنچی تو میں نے آپ کے اردلی کو پایا - یہ شخص میرا انتظار کر رہا تھا - اس نے مجھے بتایا کہ اگر میں اس کی خواہشات کے آگے نہ جھکی تو وہ ہمارے متعلق سب کچھ آپ کو بتا دے گا اور جو ہمارے خط اس نے چرا کر رکھ لئے تھے وہ آپ کو دے

ہوے گا۔"

"آہ ابا۔ ابا۔ مجھ پر خوف طاری ہو گیا —— ایک بزدلانہ خوف —— وہ خوف جو میرے شایانِ شان نہ تھا۔ میں آپ سے ڈرتی تھی حالانکہ آپ مجھ پر اس قدر مہربان تھے اور میں نے آپ کو دھوکا دیا تھا۔ مجھے اپنے چاہنے والے کی وجہ سے بھی خوف تھا کیونکہ ہو سکتا تھا آپ اُسے قتل کر دیتے اور شاید اپنی جان کا بھی خدشہ تھا میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں پاگل اور بے قابو ہو گئی۔ میں نے اس کمبخت کو دوبارہ خریدنے کا خیال کیا اور یہ کمبخت بھی مجھے چاہتا تھا۔ کتنی شرمناک بات ہے!

"ہم عورتیں بہت کمزور واقع ہوتی ہیں۔ ہم مردوں کے مقابلے میں جلد عقل کھو بیٹھتی ہیں اور جب عورت ایک دفعہ اپنے آپ کو گرا دے تو وہ پست سے پست تر ہوتی جاتی ہے۔ کیا مجھے علم تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں؟ مجھے تو صرف اس قدر سوجھتا تھا کہ تم دو میں سے ایک اور میں مر جائیں گے۔ یہ سوچ کر میں نے اپنا آپ اس درندے کے حوالے کر دیا۔

"ابا تمہیں پتہ چل گیا ہو گا کہ میں اپنے لئے کوئی عذر نہیں پیش کرنا چاہتی اس کے بعد وہی ہوا جس کے متعلق مجھے پہلے سوچنا چاہیئے تھا۔ وہ جب چاہتا ڈرا کر مجھ پہ قابو پا لیتا تھا وہ کبھی ہر صورت پہلے عاشق کی طرح میرا چاہنے والا بنا رہا کیا یہ قابلِ نفرت نہیں ہے؟ ابا اس کی سزا کیا ہونی چاہیے؟

سو اب پانی سر سے گذر چکا۔ مجھے ضرور مرنا چاہیئے جب میں زندہ

تھی تو آپ سے اقبالِ جرم نہ کر سکتی تھی مگر میں ہر کام کی جرأت کر سکتی ہوں۔
مجھے مرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ میں اس قدر ملوث تھی کہ موت کے سوا
اور کوئی چیز مجھے دھو کر صاف نہ کر سکتی تھی۔ اب میں نہ تو محبت کر سکتی تھی اور نہ
محبت کروا سکتی تھی۔ مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ جسے بھی میں اپنا ہاتھ چھونے کی
اجازت دیتی ہوں وہ داغدار ہو جاتا ہے۔

" اب میں سمندر میں نہانے لگی ہوں اور میں پھر واپس نہیں آؤں گی
تمہارے نام کا یہ خط میرے عاشق کے پاس جائے گا۔ اور یہ اُسے اس وقت
ملے گا جب میں مر چکی ہوں گی۔ اور بغیر اس کے کہ کسی کو اس کے متعلق کچھ پتہ چلے
وہ اسے آپ تک پہنچا دے گا اور یہ میری آخری خواہش کی تکمیل ہو گی۔ اور آپ
اسے قبرستان سے واپس آکر پڑھیں گے۔

" الوداع ابا جان! مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔ جو آپ کا دل چاہتا
ہے کیجئے۔ اور مجھے معاف کر دیجئے۔" کرنل نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ اچانک
اُسے وہی دلجمعی نصیب ہوئی جو اُسے میدان جنگ میں کھڑے ہو کر نصیب ہوتی
تھی۔ اس نے گھنٹی بجائی۔

ایک نوکر نمودار ہوا۔ " فلپ کو میرے پاس بھیجو" کرنل نے کہا
پھر اس نے میز کی دراز کھولی۔

اسی وقت وہ آدمی بھی داخل ہوا وہ ایک بڑا سا سرخ مونچھوں والا

سپاہی تھا جس کے چہرے سے شرارت اور آنکھوں سے مکاری ٹپک رہی تھی۔

کرنل نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"تمہیں مجھے میری بیوی کے عاشق کا نام بتانا ہوگا"

"لیکن۔ میرے کرنل ———"

کرنل نے دراز میں سے پستول اٹھاتے ہوئے کہا:

"جلدی کرو! تمہیں پتہ ہے میں مذاق نہیں کرتا"

"اچھا۔ میرے کرنل۔ وہ کپتان سینٹ البرٹ ہے"

اس نے ابھی یہ نام اپنی زبان سے ادا ہی کیا تھا کہ اس کی آنکھوں کے درمیان ایک شعلہ چمکا اور وہ منہ کے بل گرا۔ گولی اس کے ماتھے کو چیر گئی تھی۔

ہار

وہ اُن حسین و دلکش دوشیزاؤں میں سے تھی جو تقدیر کی غلطی سے معمولی درجہ کے ملازمت پیشہ گھرانوں میں جنم لیتی ہیں۔ اُس کے پاس نہ تو کوئی جہیز تھا اور نہ ہی مستقبل میں کسی وراثت کی اُمید تھی۔ وہ ذرائع بھی مفقود تھے جن سے وہ شہرت و تحسین حاصل کر کے کسی ممتاز یا متمول شخص کی محبوبہ اور بیوی بن سکتی اُس نے محکمہ تعلیم کے ایک معمولی کلرک کے ساتھ شادی کرنا گوارا کر لیا

وہ سادہ تھی کیونکہ اسے اسباب زیبائش میسّر نہ تھے۔ وہ اس عورت کی طرح ناخوش تھی۔ جسے اونچے طبقے سے نکل کر کمتر طبقہ کی ہمسری کرنی

پڑے - اس لئے کہ عورتوں کی کوئی ذات یا نسل نہیں ہوتی۔ حسن وجمال اور دلکشی ہی اُن کے لئے خاندان اور حسب ونسب کا کام دیتے ہیں - ان کی طبعی نفاست، جبلی ملاحت ، خوش مزاجی ہی ان کے طبقہ کو متعین کرتی ہیں - اور عوام کی لڑکیوں کو عالی مرتبت بیگمات کا ہمہ پلا بنا دیتی ہیں۔

وہ ہمیشہ اندوہ گیں رہتی کیونکہ وہ یہ محسوس کرتی تھی کہ وہ عیش وعشرت اور ناز ونعم کی زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے - اُسے اپنے کمرے کی فلاکت زدہ حالت، بوسیدہ دیواروں ٹوٹی پھوٹی کرسیوں اور پھٹے پرانے سامان کو دیکھ کر دکھ ہوتا تھا - ایسی تمام چیزیں، جنہیں اس جیسی کوئی اور عورت محسوس تک نہ کرتی - اس کے لئے غم وغصہ کا باعث ہوتی تھیں۔

وہ مشرقی انداز میں معلق فانوسوں سے آراستہ پرسکوں شبستانوں، اور اُن دو خدام کے متعلق سوچتی تھی - جنہیں شبستان کو حرارت پہنچانے والے آلات سے نکلی ہوئی بوجھل ہوا - آرام کرسیوں پر سلا دیتی ہے - وہ ریشمِ پارینہ سے آراستہ دیوان خانوں شاندار فرنیچر پر رکھے ہوئے عہد قدیم کے بیش قیمت نوادر اور عطر سے بسی ہوئی اُن دلفریب نشستگاہوں کے متعلق سوچتی تھی جو سرِ شام ایسے جگری دوستوں کے ساتھ خوش وقتی کے لئے مخصوص ہوتی ہیں، یہ جگری دوست ایسے مرد ہوتے ہیں جن کی عورتوں کو خواہش اور تلاش رہتی ہے - جن کی توجہ کی وہ محتاج ہوتی ہیں - اور جن کی وجہ سے وہ باہم رشک

کرتی ہیں۔

جب وہ ڈنر کے لئے اس گول میز کے پاس جس کا کپڑا تین دن سے استعمال ہو رہا تھا، اپنے خاوند کے بالمقابل بیٹھتی تو اس کا خاوند تو ڈش کا ڈھکنا خوشی خوشی اٹھاتا اور کہتا کہ "کس قدر لذیذ سالن ہے۔ اس سے بہتر کھانا۔ میرے علم سے باہر ہے" عین اسی وقت وہ (امرا) کے شاندار ڈنروں، چاندی کے چمکتے ہوئے برتنوں اور دیواروں پر آویزاں بڑی شخصیتوں اور جنگل کے نادر پرندوں کی تصاویر سے منقش قالینوں کے متعلق سوچتی تھی۔ وہ عجیب و غریب برتنوں میں رکھے ہوئے نفیس کھانوں اور ان محبت بھری سرگوشیوں اور مسکراہٹوں کے متعلق سوچتی جو رنگین مچھلی یا چوزا کھانے والوں کا حصہ ہیں۔ نہ اس کے پاس ملبوسات تھے اور نہ جواہرات۔ اور وہ صرف انہیں اشیا سے محبت کرتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ انہیں چیزوں کے لئے تخلیق کی گئی ہے۔ اس کی یہ شدید خواہش تھی کہ اسکی آرزو کی جائے اور اسے چاہا جائے اور وہ دوسروں کی خوشی کا موجب بنے۔

اسکی ایک امیر سہیلی تھی جو سکول میں اسکی ہم جماعت رہی تھی مگر اسے اس سہیلی سے ملنا پسند نہ تھا۔ کیونکہ وہ اس کے ہاں سے واپس آ کر سخت غمگین ہو جاتی تھی، اور وہ غم و غصہ اور مایوسی کے عالم میں رونے لگتی تھی۔

ایک شام اس کا خاوند اپنے ہاتھ میں ایک لفافہ تھامے بڑے فخر کے ساتھ گھر واپس آیا۔ "لیجئے۔ آپ کے لئے ایک چیز لایا ہوں" اس نے کہا۔ بیوی نے جلدی سے لفافہ کھولا اور ایک چھپا ہوا کارڈ نکالا جس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے وزیر تعلیم اور اُن کی بیگم مسٹر اور مسز لوانزل سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ۱۸ جنوری کو وزیر کے ہاں تشریف لاکر اعزاز بخشیں۔

اپنے خاوند کی توقع کے برعکس اُس نے کارڈ کو غصہ سے میز پر پھینکتے ہوئے کہا "یہ میرے کس کام کا ؟"

"لیکن میری جان! میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ تم مطمئن ہو جاؤ گی۔ تم کبھی کسی پارٹی میں نہیں جاتی ہو۔ یہ تمہارے لئے سنہری موقع ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے یہ دعوت نامہ حاصل کیا ہے۔

ہر ایک آدمی یہ دعوت نامہ لینے کا خواہش مند تھا۔ مگر چیدہ چیدہ لوگ ہی اسے حاصل کر سکے۔ تم دفتری زندگی سے متعلقہ تمام قسم کے افراد دیکھ سکو گی۔"

اس نے اُسے بگڑ کر دیکھا اور بے صبری سے کہنے لگی "میں اس موقع پر کیا پہنوں گی؟" یہ بات اس کے خاوند نے پہلے نہ سوچی تھی۔ "وہی لباس جسے پہن کر تم تھیٹر جاتی ہو۔ مجھے تو وہ بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے" اس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔ اپنی بیوی کو روتے دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور

خموش اور مبہوت ہو گیا۔ اس کے گوشہ ہائے چشم سے دو موٹے موٹے آنسو ڈھلکے اور دہن کے کناروں تک آ گئے۔

"کیا بات ہے؟ آخر کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔ بڑی شدید کوشش سے اپنے جذبات کو قابو میں لا کر وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی:

"کچھ بھی نہیں، بس یہی کہ میرے پاس کوئی لباس نہیں ہے اور میں اس پارٹی پر نہیں جا سکتی۔ تم یہ کارڈ اپنے کسی ایسے ساتھی کو دے دو جس کی بیوی کے پاس بہتر لباس ہو۔" اُسے یہ سن کر دکھ ہوا۔ تاہم اس نے جواب دیا "ماطلید، اچھا دیکھو۔ بھلا یہ تو بتاؤ کہ ایک مناسب سا سوٹ جو دیگر ایسے موقعوں پہ بھی کام آ سکے اور سادہ بھی ہو کتنے میں بنے گا۔"

اُس نے چند لمحوں کے لئے غور کیا۔ اور تخمینہ لگانے لگی تاکہ اتنی رقم کا مطالبہ کرے۔ کہ جس کو سن کر نہ تو اس کا خاوند ڈرے اور نہ ہی دینے سے انکار کرے

آخر اُس نے ہچکچاتے ہوئے کہا "میں ٹھیک تو نہیں بتا سکتی لیکن میرا خیال ہے کہ چار سو فرانک میں بن جائے گا"

یہ سُن کر اُس کا رنگ اڑ گیا کیونکہ بعینہ یہی رقم اُس نے بندوق خریدنے کے لئے بچا رکھی تھی تاکہ آنے والے موسم گرما اپنے دوستوں کے ساتھ چند دن شکار کر سکے۔ تاہم اس نے کہا "بہت خوب۔ میں تمہیں چار سو فرانک دوں گا۔ کوشش

کرو کہ خوبصورت سا ملبوس بن سکے"

دعوت و رقص کا دن آ پہنچا مگر مادام لوازل اداس اور فکر مند دکھائی دیتی تھی۔ تاہم اس کا سوٹ تقریباً تیار تھا۔ اس کے خاوند نے ایک شام اس سے کہا "کیا ماجرا ہے۔ دو تین دن سے تمہارا طرز عمل عجیب سا ہے" اُس نے جواب دیا "میرے لئے یہ بات تکلیف دہ ہے کہ میرے پاس جواہرات نہیں ہیں جن سے میں اپنے آپ کو سجا سکوں۔ میں کس قدر مفلس و نادار نظر آتی ہوں۔ بہتر تو یہی ہے کہ میں اس پارٹی میں نہ جاؤں۔"

اُس نے جواب دیا "تم چند پھول اس غرض کے لئے استعمال کر سکتی ہو۔ اس موسم میں تو وہ فیشن کے مطابق ہیں۔ دس فرانک میں تمہیں دو تین شاندار گلاب کے پھول مل سکتے ہیں" مگر وہ مطمئن نہ ہوئی۔ اور کہا "مالدار عورتوں کے درمیان پھٹیچر حالت میں جانے سے زیادہ شرمناک بات اور کیا ہو سکتی ہے"

اس پر اس کے خاوند نے چلا کر کہا "اوہو! ہم کتنے احمق ہیں! اپنی سہیلی مادام فورسٹئے کے جا کر اس کے جواہرات مستعار لے آؤ۔ تمہاری تو اس سے اچھی خاصی شناسائی ہے۔"

اُس نے خوشی سے چیخ کر کہا "بالکل درست! میں نے تو یہ سوچا ہی نہ تھا"

اگلے دن وہ اپنی سہیلی کے ہاں گئی اور ماجرائے غم اسے سنایا۔

مادام فورستیئے اپنی الماری سے جواہرات کا ڈبہ اٹھا لائی اور اسے کھول کر کہا۔ "میری جان، جو چاہو انتخاب کر لو" اُس نے پہلے کنگن، پھر موتیوں کے ہار اور اس کے بعد ہیروں سے مرصع زریں صلیب کو دیکھا۔ وہ آئینہ کے سامنے ان جواہرات کو پہن کر دیکھتی تھی مگر متامّل تھی۔ نہ تو وہ کوئی منتخب کر سکتی تھی اور نہ ہی انہیں چھوڑتی تھی۔ پھر اس نے اپنی سہیلی سے پوچھا "کیا تمہارے پاس ان کے علاوہ اور کچھ نہیں ؟"

"کیوں نہیں۔ تم خود ہی دیکھ لو۔ مجھے نہیں پتہ تمہیں کیا پسند آتا ہے"

اچانک اُسے ساٹن کی ڈبیا میں ہیروں کا ایک شاندار ہار پسند آیا۔ اور اُس کا دل ایک غیر متوازن خواہش کی شدت کے زیرِ اثر تیزی سے حرکت کرنے لگا اس ہار کو پکڑتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے اسے اپنے گلے کے قریب رکھا، پھر اپنے ملبوس کے مقابل کیا اور اُن ہیروں کو دیکھ کر اس پر وجد کی کیفیت طاری رہی۔ پھر اس نے فکرمند ہو کر ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم مجھے یہی ہار اور صرف یہی ہار مستعار دے سکتی ہو؟"

"ہاں، کیوں نہیں، بیشک"

اُس نے اپنی سہیلی کی گردن کو چوما اور اسے گلے لگایا اور اپنا خزانہ لے کر واپس آگئی۔

رقص کا دن آیا۔ مادام لوازل بہت کامیاب رہی۔ وہ سب سے زیادہ

خوبصورت، دلکش، شائستہ، خوش اطوار تھی، تبسم کناں اور خوش تھی۔ سب مرد اُسی کی طرف دیکھتے تھے اس کا نام پوچھتے اور اس سے تعارف کرنا چاہتے تھے کابینہ کے تمام ممبران اس کے ساتھ ناچنے کی تمنا رکھتے تھے۔ وزیر تعلیم نے بھی اسکی طرف متوجہ تھا۔

اُس نے بڑی گرمجوشی اور جذبہ کے ساتھ رقص کیا۔ وہ خوشی سے مست تھی۔ اُسے اپنے حُسن کی فتح، جلالِ کامرانی اور اس سحابِ مسرت میں جو تحسین وستائش، برانگیختہ خواہشات اور اُس نصرت کامل سے پیدا ہوا تھا جو ایک عورت کے دل کو بے حد عزیز ہے کچھ نہیں سوجھتا تھا۔

وہ صبح چار بجے گھر روانہ ہوئی۔ اُس کا خاوند، چھوٹے کمرے میں اُن تین افراد کے ساتھ جن کی بیویاں رقص سے خوب لذّت اندوز ہو رہی تھیں آدھی رات سے ہی نیم خوابی کے عالم میں منتظر تھا۔

اُس نے اُسے وہ لبادہ اڑھا دیا جو وہ واپسی کے لئے ساتھ لے گئے تھے یہ لبادہ لباسِ رقص کے مقابلے میں بہت بے حقیقت تھا۔ اُسے اس کا احساس تھا۔ اس لئے وہ چاہتی تھی کہ وہ جلدی سے نکل جائے تاکہ اُس پر اُن عورتوں کی نظر نہ پڑ جائے جو قیمتی پوستین زیبِ تن کئے ہوئے تھیں۔ لوازل نے اسے روکا "ٹھہرو" اُس نے کہا "میں جا کر گاڑی لے آتا ہوں۔ کہیں تمہیں سردی نہ لگ جائے۔" مگر اس نے سنی اَن سنی کر دی اور تیزی سے نیچے اتر آئی جب وہ بازار

میں پہنچے تو انہیں کوئی گاڑی نہ ملی - وہ دُور سے گاڑی بانوں کو اشارہ کرتے رہے انہوں نے عالم مایوسی میں سردی سے کانپتے ہوئے دریائے سین کی طرف چلنا شروع کیا - آخر انہیں ایک پرانی چھکڑا قسم کی گاڑی مل ہی گئی - ایسی گاڑی سوائے رات کے اور کسی وقت بھی پیرس میں نظر نہیں آتی - گویا ایسی گاڑی والے دن کو گاڑی کی وجہ سے شرم محسوس کرتے ہیں -

یہ گاڑی انہیں مارٹر سٹریٹ میں اُن کے گھر کے دروازے تک لے گئی وہ کبیدہ خاطر ہو کر گھر میں گئے - ماطلید کے لئے سب معاملہ ختم ہو چکا تھا - اور لوائزل کو یہ فکر تھی کہ اُسے دس بجے دفتر پہنچنا ہے -

اس نے اپنے شانوں سے لبادہ کو علیحدہ کیا تاکہ آئینہ میں ایک بار پھر اپنی شان و شوکت کو دیکھے - مگر یکایک اس کے منہ سے چیخ نکل گئی - اس گلے میں ہار نہیں تھا -

اُس کے خاوند نے جو اپنے کپڑے بھی تبدیل نہ کر پایا پوچھا "کیا بات ہے ؟" وہ بے تابی سے اسکی طرف متوجہ ہوئی اور کہا "میرے پاس مادام فورسٹیئے کا ہار نہیں رہا - "

وہ پریشان ہو کر اٹھ بیٹھا اور کہنے لگا "کیا ! یہ کیسے ہوا ؟ یہ ناممکن ہے ! "

انہوں نے اسے لباس کی تہوں میں ، چادر کی تہوں میں اور جیبوں میں

اور ہر طرف ڈھونڈا۔ مگر اسے کہیں نہ پا سکے۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ جب ہم نے رقص گاہ کو چھوڑا تو تمہارے گلے میں ہار تھا" اُس نے پوچھا

"ہاں میں نے باہر نکلتے ہوئے دہلیز میں اسے چھو کر دیکھا تھا"

"لیکن اگر تم نے اسے بازار میں کھویا ہے تو ہمیں اس کے گرنے کی آواز تو آتی۔ وہ ضرور گاڑی میں گرا ہوگا"

"ہاں یہ قرین قیاس ہو سکتا ہے" "مگر کیا تم نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا تھا"

"نہیں، مگر تم نے بھی تو نمبر نہیں دیکھا"

"نہیں"

اُنہوں نے غم واندوہ کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا آخر کار لوازلی دوبارہ لباس تبدیل کیا۔

میں جارہا ہوں تاکہ ہار کو اس راستے پہ تلاش کروں جو ہم نے پیدل طے کیا تھا" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

اُس میں لیٹ جانے کی ہمت نہ تھی۔ وہ گاؤن پہنے عالم بے خیالی میں کرسی پر ہی دراز ہو گئی۔ اس کی گرمیٔ حیات سرد پڑ چکی تھی سات بجے کے قریب اس کا خاوند واپس لوٹا۔ وہ کچھ بھی تلاش نہ کر سکا تھا۔ وہ پولیس سٹیشن اور گاڑیاں

چلانے والی کمپنیوں کے دفاتر میں گیا۔ اس نے اخبارات میں انعامی اشتہارات دیئے۔ اس نے ہر وہ تدبیر کی جس کے ساتھ کوئی بھی موہوم امید وابستہ تھی۔

وہ اس دہشت ناک تباہی کے خیال اور خوف و ہراس کے عالم میں دن بھر اس کا انتظار کرتی رہی۔ لوائل رات گئے اترا ہوا چہرا لیئے شام کو واپس لوٹا۔ اسے کوئی سراغ نہ مل سکا تھا۔

اس نے اپنی بیوی سے کہا "تم اپنی سہیلی کو لکھ دو کہ ہار کا بکلا ٹوٹ گیا ہے اور تم اس کی مرمت کروانا چاہتی ہو۔ اس سے ہمیں لوٹانے کے لئے وقت مل جائے گا۔

جو کچھ اس نے لکھوایا وہ لکھتی گئی۔

ایک ہفتہ گذر جانے پر انہیں ہار ملنے کی کوئی امید نہ رہی۔ لوائل جو سات دنوں میں اتنا بوڑھا ہو گیا تھا جتنا کہ ایک آدمی پانچ سال میں ہوتا ہے کہنے لگا "ہمیں اس ہار کے بدلے کوئی اور ہار واپس کرنے کی تدبیر کرنی چاہیئے۔

اگلے دن وہ ہار والی ڈبیا کو اس جوہری کے پاس لے گئے جس کا نام اس پر کندہ تھا۔ اس نے اپنے رجسٹر دیکھے اور کہا "مادام، میں نے یہ ہار نہیں بنایا، میں نے تو صرف اس کا کیس بنایا ہے" وہ اس ہار سے ملتا جلتا ہار تلاش کرنے کے لئے اپنی یادداشت سے کام لیتے ہوئے ایک دوکان سے دوسری کی طرف جاتے تھے۔ غم و غصّہ سے دونوں کی حالت سقیم تھی۔ بالآخر انہیں ایک دوکان میں گمشدہ ہار سے بالکل ملتا جلتا ہیروں کا ہار نظر آیا۔ اسکی قیمت تو چالیس ہزار فرانک تھی۔ مگر انکو چھتیس ہزار میں مل سکتا تھا۔

انہوں نے دکاندار سے درخواست کی کہ وہ اسے تین ماہ تک نہ بیچے اور اس سے یہ بھی طے کر لیا کہ وہ اس ہار کو چونتیس ہزار فرانک سے لے کر واپس کر دیں گے اگر فروری سے پہلے پہلے گمشدہ ہار مل گیا۔ لوازل کے پاس اٹھارہ ہزار فرانک کا ترکہ پدری تھا۔ باقی کی رقم اس نے ادھار لی۔ کسی سے ہزار فرانک، کسی سے پانچ سو فرانک، کسی سے پانچ لوئی اور کسی سے تین لوئی۔ ادھار لئے۔ اس نے تحریریں لکھ کر دیں اور ادائیگی کے تباہ کن وعدے کئے اور سود خوروں اور ہر طرح کے ادھار دینے والوں سے قرض لیا۔ اس نے اپنی پوری زندگی کو گروی رکھدیا۔ قرض خواہوں کو دستخط دے کر اس نے اپنے لئے خطرہ مول لے لیا حالانکہ اسے یہ خبر نہ تھی کہ وہ ادائیگی کے قابل بھی ہو سکیگا یا نہیں مصیبت کی سیاہی کی لپیٹ میں اور مستقبل کے اندیشوں اور محرومیوں کے تصور میں نیا ہار لینے چلا اور دکاندار کی میز پہ چھتیس ہزار فرانک رکھدیئے۔

جب مادام لوازل نے اپنی سہیلی مادام فورستیئے کو ہار واپس کیا تو مادام فورستیئے نے سرد مہری سے کہا "تمہیں یہ ہار جلدی واپس کرنا چاہئے تھا مجھے اس کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔

اس نے مادام لوازل کی توقع کے مطابق ہار کا ڈبہ کھول کر ہار دیکھا اگر اسے ہار بدلا ہوا دکھائی دیتا تو وہ کیا سوچتی؟ کیا کہتی؟ کیا وہ اسے چور ٹھہراتی؟ -

اب مادام لوازل کو پتہ چلا کہ حاجتمندی کی زندگی کیا ہوتی ہے مگر اس نے بہادری سے اپنے تمام فرائض ادا کئے۔ اس خوفناک قرض کی ادائیگی ضروری تھی۔ اس نے قرض اتارنے

کا تہیہ کر لیا۔

خادمہ کو رخصت کر دیا گیا مکان رہائش تبدیل کر لیا اور معمولی درجہ کے کرے کرایہ پر لئے۔ اس نے امور خانہ داری کی مشکل ذمہ داریاں کو قبول کیا۔ اور کچن کے دھندوں میں پھنس گئی۔ وہ خود برتن صاف کرتی اور اپنے گلابی ناخنوں سے چکناہٹ اتارتی اور دیگچیوں کے پیندے مانجھتی تھی وہ صافی، دستر خوان اور شمیض دھوتی اور سوکھنے کے لئے رسی پہ پھیلا دیتی تھی۔ ہر صبح وہ کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لئے اترتی تھی۔ اور پانی خود ہی اٹھا کر اوپر لے جاتی تھی، اسے منزل پہ سستانے کے لئے ٹھہرنا پڑتا تھا۔ وہ اپنی کلائی کے ساتھ ٹوکری لٹکائے خود ہی سودا سلف خریدنے نکلتی اور پیسہ پیسہ پر سودا بازی کرتی تھی ہر ماہ کچھ قرضے چکانے پڑتے تھے اور کچھ کے لئے مزید مہلت لینی پڑتی تھی۔ خاوند دفتر میں کام کرنے کے علاوہ شام کو دو کانداروں کا بھی کھاتہ درست کرتا تھا اور رات کو پانچ سُو (SOUS) فی صفحہ کی اُجرت پہ نقل نویسی کرتا تھا۔ دس سال تک یہی صبح و شام رہے۔ دس سال کے اختتام تک انہوں نے قرض خواہوں کا قرضہ سُود سمیت واپس لوٹا دیا۔

اب مادام لوازل عمر رسیدہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ غریب گھرانے کی سخت کرخت، اور کڑیل عورت میں تبدیل ہو چکی تھی نہ کنگھی کرنے کا سلیقہ باقی رہا تھا اور نہ لباس کی درستگی کا قرینہ۔ ہاتھ سُرخ ہو چکے تھے۔ وہ اونچی آواز سے بولتی تھی اور خود ہی فرش صاف کرتی تھی۔ ہاں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر جبکہ اس کا خاوند دفتر میں ہوتا تھا۔ اُس حسین شام کے تصور سے لطف اندوز ہوتی تھی جو

اس نے دس سال قبل اس شان سے گزاری تھی کہ سبھی اس کے حسین چہرے کی دلکشی پر فریفتہ تھے۔ اگر ہار گم نہ ہوتا تو اس کی زندگی کتنی حسین ہوتی؟ کون جانتا ہے؟ زندگی کتنی منفرد اور کس قدر انقلاب آفرین ہے! کتنی عجیب بات ہے کہ ایک معمولی سا واقعہ زندگی و موت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔

ایک اتوار کو جب وہ شان زے لیزے کی سیرگاہ میں گھوم پھر کر ہفتہ بھر کے تفکرات سے نجات حاصل کر رہی تھی کہ اس نے ایک عورت کو ایک بچہ کے ساتھ سیر کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ اسکی سہیلی مادام فورستیے تھی۔ جواب بھی ویسی ہی جوان، خوبصورت اور دلکش تھی۔ مادام لوازل اسے دیکھ کر بہت متاثر ہوئی۔ "کیا مجھے اس سے ہمکلام ہونا چاہیئے۔" اس نے اپنے دل سے پوچھا۔ "کیوں نہیں، اب تو میں نے سب قرض ادا کر دیا ہے۔ اب میں اسے سب کچھ بتا دوں گی" اس نے سوچا۔ اس نے اس کے قریب جا کر اُسے سلام کیا۔ اس کی سہیلی نے اسے نہ پہچانا، بلکہ اسے اس بات پر سخت حیرت ہوئی۔ کہ ایک معمولی درجہ کی عورت نے اسے اتنی بے تکلفی سے مخاطب کیا ہے اور اس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا

"لیکن مادام میں آپ کو نہیں جانتی، آپ کو مغالطہ ہوا ہے۔"

"نہیں۔ میں مادام لوازل ہوں"

اس پر اس کی سہیلی حیرت زدہ ہو کر چلا اٹھی "ہائے میری بیچاری ماٹلیدہ! تم کس قدر بدل گئی ہو"

"ہاں۔ جس دن سے میں نے تمہیں دیکھا ہے۔ اس دن سے مجھے بہت سی مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا"

"میری وجہ سے؟ کیوں، ایسا کیوں ہوا؟"

"ذرا اس ہار کو یاد کرو جو تم نے مجھے وزیر کے ہاں رقص پر پہننے کے لئے مستعار دیا تھا۔"

"ہاں! مجھے خوب یاد ہے"

"میں نے اسے کھو دیا تھا"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے! تم نے تو وہ مجھے واپس لوٹا دیا تھا۔"

"میں نے تو کوئی اور ہار جو اس سے بالکل ملتا جلتا تھا واپس لوٹایا تھا۔ اور ہمیں اس کی قیمت ادا کرتے کرتے دس سال لگ گئے۔ تم خود سمجھ سکتی ہو کہ ہم جیسے غریبوں کے لئے یہ ادائیگی آسان کام نہ تھی مگر قرض ختم ہو چکا ہے اور میں مطمئن ہوں۔"

مادام فورستیئے دم بخود رہ گئی اور کہا "کیا تم یہ کہہ رہی ہو کہ تم نے میرے ہار کے بدلے ہیروں کا ہار واپس کیا"

ہاں۔ کیا تم نے اس وقت نہیں جانا۔ دونوں ہار بالکل ایک دوسرے کی مانند تھے" یہ کہکر وہ خوشی اور فخر کے ساتھ مسکرائی مادام فورستیئے کا دل بھر آیا اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر جواب دیا۔

"آہ میری بیچاری ماطیلد! لیکن میرا ہار تو مصنوعی موتیوں

کا تھا اور اس کی قیمت تو پانچ سو فرانک سے زیادہ نہ تھی۔"

سفر میں

گاڑی کنس کے مقام سے ہی پر تھی - لوگ گفتگو کر رہے تھے - سب ایک دوسرے کے شناسا تھے - جب وہ طارسکوں سے گذرے تو کسی نے کہا : " یہی وہ جگہ ہے جہاں کھونی قاتل ہے " انھوں نے ایک پراسرار اور منفرد قاتل کے متعلق گفتگو شروع کر دی جس نے پچھلے دو سالوں سے چند مسافروں کو قتل کیا تھا ہر ایک نے قیاس آرائی کی اور اپنی رائے کا اظہار کیا - عورتیں خوفزدہ ہو کر گاڑی کی کھڑکی سے باہر جھانک کر رات کے اندھیرے میں دیکھتیں اور گاڑی کے دروازے پر کسی آدمی کا سر دیکھ کر دفعتہً ڈر جاتی

تھیں انہوں نے خوفناک ملاقاتوں کی ڈراؤنی باتیں کرنی شروع کیں۔ بھاگتی ہوئی ٹرین میں پاگلوں سے ملاقات اور مشکوک آدمیوں کے مقابل گھنٹوں رہنے کا ذکر بھی ہُوا۔

ہر آدمی کو اپنی برتری ظاہر کرنے کے لئے ایک واقعہ یاد تھا ہر ایک نے کسی بُرے شخص کو نہایت ہی حیران کن حالات میں یا تو ڈرایا تھا، یا مغلوب کیا تھا یا گلا گھونٹ کر ختم کر دیا تھا۔ اور بہادری اور حاضر دماغی کا ثبوت دیا تھا۔

ایک ڈاکٹر جو ہر سال موسم سرما وسطی فرانس میں بسر کرتا تھا ایک واقعہ سنانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا: "مجھے اس قسم کے حالات میں اپنی بہادری آزمانے کا کبھی موقع نہیں ملا لیکن میں ایک عورت کو جانتا ہوں جسے دنیا کا عجیب ترین دردناک ترین اور پراسرار ترین واقعہ پیش آیا۔ وہ میرے مریضوں میں سے تھی اور وہ مر چکی ہے۔

"وہ ایک روسی عورت تھی۔ جس کا نام کونٹیس میری بارانو تھا۔ وہ نہایت اعلیٰ مرتبہ خاتون تھی اور حُسن میں بھی اپنا جواب نہ رکھتی تھی آپ جانتے ہی ہیں کہ روسی عورتیں کس قدر حسین ہوتی ہیں کم از کم ہمیں، تو وہ بہت ہی حسین معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی ناکیں کتنی عمدہ ہوتی ہیں۔ ان کے منہ نازک اور آنکھوں کا رنگ ناقابل بیان ہوتا ہے۔ جو سلیٹی مائل نیلا ہوتا ہے۔ اور اُن کا سرد مہری سے بھرا ہوا انداز قدرے درشت ہوتا ہے وہ کسی قدر شرارتی اور جذبات ابھارنے والی، مغرور اور شیریں اور بیک وقت نرم اور

درشت ہوتی ہیں اور اپنی ان صفات کی وجہ سے فرانسیسیوں کو بہت دلکش معلوم ہوتی ہیں۔ شاید نسل کا امتیاز مجھے ان میں اس قدر خوبیاں دکھاتا ہے۔ اس کے معالج نے کئی سالوں سے اُسے دِق کے مرض سے آگاہ کر دیا تھا اور اُسے وسطی فرانس میں جانے کا مشورہ دیا تھا۔ مگر وہ سینٹ پیٹرزبرگ نہ چھوڑنے پر مُصر تھی۔ آخر پچھلے سال موسم خزاں میں اس نے اس کی حالت کو انتہائی خراب پاکر اس کے خاوند کو خبردار کیا جس نے اپنی بیوی کو فوراً مینٹون روانہ ہونے کے لئے کہا۔

وہ ٹرین پر سوار ہو گئی۔ وہ اپنے ڈبے میں تنہا تھی اور اس کے نوکر دوسرے ڈبے میں تھے۔ وہ دروازے کے قریب اداس بیٹھی بھاگتے ہوئے کھیت اور گاؤں دیکھتی رہی۔ وہ خود کو تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کر رہی تھی۔ نہ اس کی اولاد تھی نہ کوئی رشتہ دار تھا۔ اس کے خاوند کے دل سے اسکی محبت نکل چکی تھی اور اس نے اسے دنیا کے آخری کونے میں پھینک دیا تھا وہ خود اس کے ساتھ اسے چھوڑنے تک نہ آیا تھا اسے اس طرح یہاں بھیجا گیا تھا۔ جیسے کسی نوکر کو ہسپتال بھیج دیا جاتا ہے۔

اس کا خادم جس کا نام ایوان تھا ہر سٹیشن پر اپنی مالکہ سے اس کی ضروریات معلوم کرنے آتا تھا۔ وہ پرانا ملازم تھا اور جسے اس کے ساتھ گہری وابستگی تھی اور جو اس کا ہر حکم بجالانے کو تیار تھا۔

رات پڑ گئی اور ٹرین پوری رفتار سے چلنے لگی۔ وہ متفکر اور مضطرب تھی اس لئے سو نہ سکی۔ اچانک اسے اس رقم کو گننے کا خیال آیا جو اس کے خاوند نے اُسے

چلتے وقت فرانسیسی طلائی سکوں کی صورت میں دی تھی۔ اس نے اپنا تھیلا کھولا اور یہ چمکتا ہوا سیلاب اپنی جھولی میں انڈیل لیا۔ دفعتہ ہوا کا خنک جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ کاؤنٹیس میری نے گھبرا کر اپنی شال اس رقم پر رکھ دی اور انتظار کرنے لگی۔ چند لمحے بعد ایک آدمی جس کا سر ننگا اور ہاتھ زخمی تھا شام کا لباس پہنے ہانپتا ہوا نمودار ہوا۔ اس نے دروازہ بند کر کے اپنے ہمسایہ کو چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اپنی خون آلود کلائی پہ رومال لپیٹا۔

نوجوان عورت نے محسوس کیا کہ وہ خوف سے بیہوش ہو رہی ہے۔ اس شخص نے یقیناً اسے رقم گنتے ہوئے دیکھا تھا اور اسے لوٹنے اور قتل کرنے آیا تھا وہ اکھڑی ہوئی سانس کے ساتھ اسے دیکھتا رہا اس کے خدوخال میں تناؤ پیدا ہوا۔ بلاشبہ وہ اس پہ جھپٹنے ہی والا تھا۔

اس نے اچانک کہا، "مادام، ڈریئے نہیں!" وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ اسمیں منہ کھولنے کی سکت تک نہ تھی۔ وہ اپنے دل کی دھڑکنیں اور سائیں سائیں کی آوازیں سن رہی تھی۔

نووارد نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا! "مادام میں کوئی بدکردار شخص نہیں ہوں"

اس نے کچھ جواب نہ دیا مگر دفعتہ اس کے متحرک ہونے سے اس کے دونوں گھٹنے مل گئے اور اس کا تمام زر فرش پہ یوں بہنے لگا جیسے پرنالوں سے پانی بہتا ہے

آدمی نے حیران ہو کر اس دھات کی ندی کو دیکھا اور اُسے اکٹھا کرنے کے لئے جھکا۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور تمام دولت قالین پر گرا دی اور دروازے کی طرف باہر کودنے کے لئے دوڑی وہ اس کے اس ارادے کو سمجھ گیا۔ اس نے اٹھ کر اُسے اپنے بازوؤں میں پکڑ کر جبراً بٹھایا اور اس کی دونوں کلائیاں پکڑ لیں اور کہا "مادام۔ میری بات سنیئے! میں کوئی بدکردار نہیں ہوں جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں یہ تمام رقم اکٹھی کر کے آپ کو لوٹانے لگا ہوں۔ لیکن اگر آپ مجھے سرحد پار کرنے میں مدد نہ دیں گی تو مجھے مردہ اور تباہ شدہ سمجھ لیجئے۔ اس سے زیادہ میں آپ کو اور کچھ نہیں بتا سکتا۔ ایک گھنٹہ میں ہم روس کے آخری سٹیشن پر پہنچ جائیں گے اور ایک گھنٹہ اور بیس منٹ میں ہم اس سلطنت کی حد پار کریں گے۔ اگر آپ میری مدد نہ کریں گے تو میں تباہ ہو جاؤں گا اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ نہ تو میں نے کسی کو قتل کیا ہے اور نہ کسی کو لوٹا ہے اور نہ ہی کوئی خلاف عزت کام کیا ہے۔ میں آپ سے قسمیہ کہہ رہا ہوں۔ میں زیادہ عرض نہیں کر سکتا"

یہ کہکر اس نے گھٹنے ٹیک کر سونا اکٹھا کرنا شروع کیا اور اس نے وہ سونا بھی تلاش کر لیا جو نشستوں کے اندر چھپ گیا تھا۔ جب چمڑے کا تھیلا بھر گیا تو اس نے اپنے ساتھی کے حوالے کر دیا۔ اور بغیر ایک لفظ بولے ڈبے کے دوسرے کنارے پر جا بیٹھا۔ دونوں میں سے کوئی بھی نہ ہلا۔ وہ خاموش اور بلا حرکت بیٹھی رہی۔ اگرچہ ابھی تک خوف کی وجہ سے بیہوشی سی محسوس کر رہی "

گم رفتہ رفتہ اس کی حالت درست ہو رہی تھی۔ جہاں تک اس مرد کا تعلق ہے اس نے نہ کوئی اشارہ کیا اور نہ کوئی حرکت کی۔ وہ اپنے سامنے دیکھتا رہا۔ وہ اس قدر زرد تھا کہ مردہ معلوم ہوتا تھا کبھی کبھی وہ تیزی سے اس کی طرف دیکھتی اور اسی تیزی سے اپنی نظریں ہٹا لیتی تھی۔ اس کی عمر تیس سال معلوم ہوتی تھی وہ بہت خوبصورت تھا۔ اور چہرے سے شرافت ٹپکتی تھی گاڑی تیز سیٹی بجاتی ہوئی اندھیرے میں سے گزر رہی تھی کبھی آہستہ چلتی تھی اور کبھی رفتار تیز کر لیتی تھی۔ مگر جلدی اس کی رفتار بہت آہستہ ہو گئی اور چند تیز سیٹیاں بجانے کے بعد ٹھہر گئی۔

ایوان احکام بجا لانے کے لئے دروازے پر آیا۔ کاؤنٹیس میری نے آخری بار اپنے اجنبی ساتھی کی طرف دیکھا۔ اسکی آواز کانپ رہی تھی اس نے اپنے نوکر سے کہا: "ایوان تم کاؤنٹ کے پاس واپس چلے جاؤ مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں ہے"

وہ بیچارہ گھبرا گیا اور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ ہکلاتے ہوئے کہنے لگا "لیکن بیگم صاحبہ ——"

"نہیں تم میرے ساتھ نہ آؤ۔ میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم روس میں ہی رہو۔ واپس جانے کے لئے یہ رقم لے لو اور اپنی ٹوپی اور چوغہ مجھے دے دو"

خوفزدہ پرانے خادم نے اپنی ٹوپی چوغہ اتارا اور بغیر پوچھے حکم بجا

لایا کیونکہ وہ اپنے مالکوں کی اچانک، اور عجیب و غریب خواہشوں کو پورا کرنے کا عادی تھا۔ وہ آنکھوں میں آنسو لئے واپس چلا گیا۔

گاڑی سرحد کی طرف تیزی سے روانہ ہوئی۔ کاؤنٹیس میری نے اپنے ہمسفر سے کہا "موسیو! یہ سب کچھ تمہارے لئے کیا ہے۔ تم الیوال یعنی میرے خادم کی حیثیت سے سرحد پار کرو گے۔ اور یہ سب کچھ میں ایک شرط پر کر رہی ہوں وہ یہ کہ تم میرے ساتھ کوئی بات نہ کرو گے خواہ شکریہ ہی کیوں نہ ادا کرنا ہو۔" اجنبی نے سر جھکا کر بغیر کچھ کہے نیازمندی کا اظہار کیا۔ جلد ہی گاڑی ایک بار پھر رُکی اور افسران وردی پہنے گاڑی کے پاس آئے۔ کاؤنٹیس نے انہیں کاغذات دکھائے اور ڈبے کے کونے پر بیٹھے ہوئے اجنبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ میرا خادم الیوال ہے جس کا پاسپورٹ یہ ہے۔" گاڑی پھر سے روانہ ہوئی۔ رات بھر وہ ایک دوسرے کے مقابل خاموش بیٹھے رہے۔ صبح جب گاڑی جرمنی کے کسی سٹیشن پر رکی تو اجنبی باہر نکلا اور دروازے کے قریب جا کر کہا: "مادام! معاف کیجئے گا میں اپنا وعدہ توڑ رہا ہوں کیوں کہ آپ میری وجہ سے اپنے خادم سے محروم ہو گئی ہیں اس لئے مناسب یہی ہے کہ میں آپ کے نوکر کی جگہ لوں۔ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو فرمائیے۔"

اس نے لاپرواہی سے کہا: "جائیے میری خادمہ کو تلاش کیجئے۔" وہ اُسے بلانے گیا اور اس کے بعد غائب ہو گیا۔

جب وہ کسی سٹیشن پر کھانا کھانے کے لئے اترتی تھی تو اُسے دور سے

اپنی نظریں جھکائے ہوئے باتیں کرتی تھی۔ آخر وہ منتہیٰ کے مقام پر پہنچ گئے۔

ڈاکٹر کچھ عرصہ خاموش رہا اور پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا: "جب میں اپنے کمرے میں مریض دیکھ رہا تھا تو ایک طویل قامت نوجوان اندر آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا:

"ڈاکٹر صاحب میں آپ سے کاؤنٹیس میری بارٹو کا حال پوچھنے آیا ہوں اگرچہ وہ مجھے نہیں جانتی مگر میں اس کے خاوند کا دوست ہوں۔"

میں نے کہا وہ ختم ہو چکی ہے وہ کبھی ہوش واپس نہ پائیگی یہ سن کر وہ نوجوان سسکیاں بھرنے لگا اور پھر اٹھ کر شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔ اسی شام میں نے کاؤنٹیس کو بتایا کہ ایک اجنبی اس کا حال دریافت کرنے آیا تھا اس کے دل پر میری بات کا بہت اثر ہوا اور اُس نے مجھے وہ تمام واقعہ سنایا جو میں اب تک آپ کو سنا چکا ہوں۔ اس کے بعد وہ کہنے لگی "یہ آدمی جسے میں مطلقاً نہیں جانتی میرے پیچھے سائے کی طرح لگا ہوا ہے۔ جب بھی میں باہر جاتی ہوں وہ مجھے ملتا ہے۔ وہ عجیب انداز سے میری طرف دیکھتا ہے لیکن اُس نے مجھ سے کبھی بات نہیں کی" یہ کہکر وہ کچھ سوچنے لگی اور پھر مجھ سے کہا: "آئیے! میں شرط لگا سکتی ہوں کہ وہ اس وقت عین کھڑکی کے نیچے ہے"

وہ کرسی سے اُٹھی اور کھڑکی کے قریب جاکر پردے ہٹا دیئے اور مجھے وہ آدمی دکھایا جو میرے پاس آیا تھا۔ وہ دیوار کے قریب ایک بنچ کے

کونے پر بیٹھا ہوا تھا اور اسکی نگاہیں مکان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ہمیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور بغیر مڑ کر دیکھے چلا گیا۔ مجھے ایک تعجب خیز مگر خوفناک حقیقت کا احساس ہوا جو ایک دوسرے کے شناسا نہ تھے ...... ! وہ اس سے اس جانور کی طرح محبت کرتا تھا جسے اس نے موت کے منہ سے بچا لیا ہو اور وہ اس کا مرتے دم تک شکر گذار تھا اور اسکی زندگی اسی کے لئے وقف تھی وہ ہر روز مجھ سے اس کا حال پوچھنے آتا تھا کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اس کے دل کی بات جانتا ہوں۔ اور جب وہ اُسے دن بدن کمزور اور زرد ہوتے دیکھتا تھا تو زار و قطار روتا تھا۔

وہ کہتی تھی کہ میں نے صرف ایک بار اس اجنبی سے بات کی ہے۔ مگر مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں اُسے بیس سال سے جانتی ہوں۔

جب وہ ملتے تھے تو وہ اس کے سر جھکانے کا جواب بڑی دلکش مگر سنجیدہ مسکراہٹ سے دیتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اگرچہ اُسے اپنے بچنے کی کوئی امید نہ تھی مگر وہ خوش تھی کہ اُسے اس طرح چاہا جا رہا ہے کہ اس چاہ میں عزت، وفاداری، اور مبالغہ آمیز شاعری کی طرح کے سے جذبات شامل ہیں اس کے باوجود وہ اس کا نام جاننے اور اس سے ملنے سے انکار کرتی رہی اور اپنی اس عالیشان ضد پہ قائم رہی وہ کہتی تھی، "نہیں۔ نہیں ...... ایسا کرنے سے یہ عجیب و غریب دوستی آلودہ ہو جائے گی۔ ہمارا ایک دوسرے کے لئے اجنبی رہنا ضروری ہے۔"

جہاں تک اس اجنبی کا تعلق ہے وہ رومان پسند طبیعت کا مالک تھا اس نے اپنی محبوبہ کے قریب ہونے کے لئے کوئی عملی قدم نہ اٹھایا۔ وہ اس سے کبھی کلام نہ کرنے کے فرسودہ اور بے معنی وعدے کو جو اس نے اس کے ساتھ گاڑی میں کیا تھا آخری دم تک نبھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اکثر اپنی کمزوری کے باوجود وہ اپنی آرام کرسی سے اٹھ کر پردہ اٹھا کر دیکھتی تھی کہ وہ اس کی کھڑکی کے نیچے بیٹھا ہوا ہے کہ نہیں۔ اور جب وہ اُسے بنچ پر بے حرکت بیٹھے دیکھ لیتی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی اور وہ واپس آ کر لیٹ جاتی۔

ایک صبح وہ دس بجے کے قریب مر گئی۔

جب میں مکان سے باہر نکلا تو وہ میرے پاس آیا۔ اس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ اُسے پہلے ہی سے اس خبر کا علم ہو چکا تھا۔

"میں اُسے لمحہ بھر کے لئے آپ کی موجودگی میں دیکھنا چاہتا ہوں"

اُس نے کہا :

میں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور ہم دونوں اکٹھے مکان میں داخل ہوئے۔

اس نے مردہ عورت کے بستر کے قریب پہنچ کر اس کے ہاتھ کو طویل اور جذبات سے بھرپور بوسہ دیا اور پھر دیوانہ وار گھر سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر پھر خاموش ہو گیا، کچھ دیر بعد بولا : "تو یہ ہے وہ واقعہ جو میرے

نزدیک عجیب ترین ہے۔ اور یہ بھی ضرور کہنا چاہیے کہ مرد عجیب طرح کے پاگل ہوتے ہیں"
ایک عورت نے آہستہ سے کہا: "وہ دونوں اتنے پاگل نہ تھے جس قدر کہ تم سمجھ رہے
ہو۔ وہ ــــــــ تھے وہ ــــــــ تھے" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی
کیونکہ وہ رو رہی تھی۔ چونکہ اُسے چپ کرانے کے لئے گفت گو کا رخ بدل دیا گیا
اس لئے کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔

انتقام

پالو ساویرینی کی بیوہ اپنے بیٹے کے ساتھ ایک چھوٹے سے غریبانہ مکان میں شہر بونی فاسیو کی فصیل پر رہتی تھی۔ یہ شہر پہاڑ کے اوپر بنا ہوا ہے اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں سمندر کے اُوپر لٹک رہا ہے اور یہاں سے سارڈینیا کے نشیبی حصے نظر آتے ہیں۔ اس کے نیچے دوسری جانب چٹان میں ایک شگاف ہے جو بہت بڑے برآمدے سے مشابہ ہے اور جو بندرگاہ کا کام دیتا ہے۔ یہاں سے دو دیواروں کے درمیان ایک لمبا چکر کاٹنے کے بعد ہم مکانوں

اطالوی اور سارڈینی مچھلی پکڑنے والی کشتیوں اور اس پرانے سٹیمر کے پاس پہنچتے ہیں جو پندرہ دن میں صرف ایک دفعہ یہاں سے اجاشیو کی طرف آتا جاتا ہے۔

سفید سفید پہاڑیوں پہ مکانوں سے گھری ہوئی جگہ سفید تر معلوم ہوتی ہے اس خوفناک راستے کے اوپر جہاں جہاز آنے کی جرأت نہیں کر سکتے یہ مکان جنگلی پرندوں کے چٹانوں کے ساتھ بندھے ہوئے گھونسلے معلوم ہوتے ہیں۔ ہوا مسلسل سمندر اور ساحل سے ٹکراتی رہتی ہے۔ اور اسی وجہ سے اس شکستہ ساحل پہ بہت کم ہریالی ہے یہ خلیج میں تیزی سے چلتی ہے۔ جس کے دونوں کناروں کو اس نے بری طرح سے پامال کر دیا ہے۔ لہروں کو چیرتی ہوئی چٹانوں کے لاتعداد سروں کے ساتھ بندھی ہوئی زرد جھاگ کے سلسلے سطح آب پر بہتے اور تھرکتے ہوئے کپڑے کے ٹکڑوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔

چٹان کے کنارے پر واقع بیوہ ساویرینی کے گھر کی تین کھڑکیاں تھیں۔ جو ویران اور وحشت انگیز افق کے مقابل کھلتی تھیں۔ وہ اس مکان میں اپنے لڑکے آنتوان اور سیمیلانٹ نامی کتیا کے ساتھ رہتی تھی۔ جو رکھوالے کتوں کی نسل سے تھی اور جس کا جسم بڑا اور بال لمبے اور کھردرے تھے نوجوان لڑکا اس کے ساتھ شکار کھیلتا تھا۔

ایک شام کسی جھگڑے کے بعد آنتوان ساویرینی کو نکلس راولاتی نے دھوکے سے قتل کر دیا اور خود اسی رات بھاگ کر سارڈینیا کی طرف چلا گیا۔

جب راہگیر بوڑھی عورت کے پاس اس کے بیٹے کی لاش لائے تو

وہ بجائے رونے کے دیر تک بے حس و حرکت اسکی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اپنا جھریوں بھرا ہاتھ اس کے مردہ جسم پر پھیر کر انتقام کا وعدہ کیا۔ اس نے کسی کا اپنے ساتھ رہنا پسند نہ کیا۔ اور وہ اسکی لاش اور کتیا کے ساتھ کمرے میں بند ہو گئی۔

کتیا لگاتار غرّاتی رہی۔ وہ میت کے بستر کے قریب کھڑی تھا اس کا سر اپنے مالک کی طرف کھنچا ہوا تھا اور اسکی دم اسکی دو ٹانگوں کے درمیان بل کھا رہی تھی۔ وہ مقتول کی ماں کی طرح جواب اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ کر آنسو بہا رہی تھی وہاں سے نہ ہلتی تھی۔ نوجوان لڑکا پیٹھ کے بل سویا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے خاکستری رنگ کا کوٹ پہنا ہوا تھا جو سینے پر سے پھٹا ہوا تھا اور خون آلودہ تھا۔ اسکی قمیص، واسکٹ، پائجامے، چہرے اور ہاتھوں پر خون تھا۔ اس کے ہر طرف خون ہی خون تھا۔ اسکی داڑھی اور بالوں میں بھی خون کے دھبے جمے ہوئے تھے۔

بوڑھی ماں نے اس کے ساتھ بولنا شروع کیا۔ اسکی آواز سن کر کتیا خاموش ہو گئی۔ اس نے کہا، " ہاں۔ ہاں۔ میرے بیٹے تمہارا انتقام لیا جائے گا۔ میرے غریب بچے! سو رہو۔ سو رہو۔ تمہارا انتقام لیا جائے گا۔ کیا تم سنتے ہو؟ یہ تمہاری ماں ہے جو تم سے وعدہ کرتی ہے! اور تم خوب جانتے ہو کہ اس نے ہمیشہ اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔"

اُس نے جُھک کر بیٹے کے لبوں پر بوسہ دیا۔ کتیا نے پھر غرّانا شروع کیا۔ وہ لمبی۔ شکایت آمیز اور خوفناک آواز میں غرّاتی رہی۔

عورت، لاش اور کتیا صبح تک وہیں رہے۔

اگلے دن آنتوان ساد یہ ینی کو دفن کر دیا گیا اور جلد ہی شہر میں اس کا تذکرہ بھی ختم ہو گیا۔ نہ اس کا کوئی بھائی تھا اور نہ ہی کوئی رشتہ دار تھا۔ اس کا انتقام لینے والا کوئی مرد نہ تھا۔ صرف بوڑھی ماں ہی انتقام کے متعلق سوچتی تھی۔

خلیج کی دوسری جانب ساحل پر وہ صبح شام ایک سفید دھبے کی طرف دیکھتی تھی۔ یہ ایک دھبہ لونگو سارو نامی ایک گاؤں تھا جو سار ڈینیا کے علاقے میں واقع تھا۔ جب کارسیکا کے ڈاکوؤں کا بہت زیادہ تعاقب کیا جاتا تھا تو وہ یہاں آ کر چھپ جاتے تھے۔ اور اسی گاؤں میں رہنا شروع کر دیتے تھے۔ جو ان کے ملک کے عین سامنے تھا اور وہاں پر واپسی کے منتظر رہتے تھے اور موقع پا کر پھر سے اپنی کمین گاہوں میں پہنچ جاتے تھے اور وہ جانتی تھی کہ اس کے بیٹے کا قاتل نکلس راوولاتی اسی گاؤں میں پناہ گزین ہے۔

وہ تنہا سارا دن کھڑکی میں بیٹھی اسی مقام کی طرف دیکھتی اور انتقام کے متعلق سوچتی رہتی تھی۔ وہ کسی کی مدد کے بغیر یہ کام کیسے کر سکتی تھی۔ وہ بوڑھی ہو چکی تھی اور اس کے مرنے کے دن قریب تھے۔ مگر وہ وعدہ کر چکی تھی۔ اس نے لاش کے قریب بیٹھ کر قسم کھائی تھی۔ وہ کیسے فراموش کر سکتی تھی؟ وہ مزید تاخیر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر وہ یہ کام کیسے سرانجام دے؟ وہ رات کو سو نہیں سکتی تھی وہ بہت شدت سے حل تلاش کر رہی تھی اور اس کا چین آرام ختم ہو چکا تھا۔ کتیا اس کے قدموں میں سوتی تھی اور کبھی کبھی اپنا

سر اٹھا کر وہ مقام کی طرف غرانے کی آواز بھیجتی تھی۔ کیونکہ اس کا مالک موجود نہ تھا اس لئے وہ اکثر اسی طرح غراتی تھی۔ گویا وہ اُسے بلا رہی ہے گویا اس کے دل میں اپنے مالک کی نہ مٹنے والی یاد جاگزیں تھی۔ ایک رات جب کتیا اس انداز سے غرا رہی تھی تو ماں کو انتقام لینے کا ایک وحشیانہ اور بھیانک خیال سوجھا۔ وہ صبح تک اس پر غور کرتی رہی۔ دن چڑھتے ہی وہ گرجا میں عبادت کے لئے گئی اور خدا کے سامنے زمین پر سر بسجود ہو کر دعا مانگی کہ وہ اس کی اس کام میں مدد کرے اور اس کے ضعیف اور کمزور جسم میں اتنی طاقت دے دے کہ وہ اپنے بیٹے کا انتقام لے سکے۔

اس کے بعد وہ واپس آ گئی۔ اس کے صحن میں لوہے کا ایک بڑا سا مٹکا تھا جو اوپر سے اندر کو دھنسا ہوا تھا اور جس میں بارش کا پانی گندی نالیوں سے گزر کر اکٹھا ہوتا تھا۔ اس نے اسے خالی کر کے اوندھا کر دیا اور اس پر لکڑیاں اور پتھر رکھ کر زمین کے ساتھ جما دیا۔ اس کے بعد اس نے کتیا کو اس محراب میں زنجیر سے باندھ دیا اور خود اندر چلی گئی۔ وہ کمرے میں لگاتار بے چینی سے چلتی رہی۔ اس کی نظریں سارڈینیا کے ساحل پر جمی ہوئی تھیں کیونکہ وہ قاتل وہیں تھا۔

کتیا رات دن غراتی رہی۔ بڑھیا نے صبح ایک پیالے میں اُسے پانی دیا اس کے سوا نہ تو اُسے روٹی دی اور نہ ہی شوربا۔ تمام دن گزر گیا اور کتیا بھوک سے نڈھال ہو کر سو گئی۔ اگلے دن اسکی آنکھیں چمکنے لگیں اور اس کے بال کھڑے ہو گئے اور وہ زور زور سے زنجیر کھینچنے لگی۔ لیکن بوڑھی عورت نے اسے کھانے کو کچھ نہ

دیا۔ وہ غضبناک ہو گئی اور کرخت آواز سے بھونکنے لگی ۔ اسی طرح رات گذر گئی۔ دن نکلتے ہی وہ اپنے ہمسایہ سے تنکوں کے دو گٹھے مانگ لائی اور اس نے اپنے خاوند کے پرانے کپڑوں کو بھوسے سے بھر کر انسانی جسم سے ملتی جلتی سی چیز بنالی۔ پھر اس نے کتیا کی محراب کے سامنے ایک چھڑی زمین میں گاڑ کر اس بھوسے کے بنے ہوئے جسم کو اس کے ساتھ باندھ دیا پھر اس نے کپڑے سے اس کا سر بنایا۔ کتیا حیرت سے تنکوں کے بنے ہوئے آدمی کو بھوک سے بے تاب ہونے کے باوجود خاموشی سے دیکھتی رہی۔

بڑھیا قصاب کی دکان پر گئی اور ایک لمبی سی آنت خریدی اس نے گھر واپس آکر صحن میں آگ جلا کر قیمہ بھر کر اس آنت کو پکایا کتیا بیقراری سے ادھر ادھر اچھلنے لگی اور اس کے منہ سے جھاگ چھوٹ رہی تھی اس کی نگاہیں اس گوشت پر لگی ہوئی تھیں۔ جس کی بو اس کے معدے میں پہنچ رہی تھی۔

بوڑھی عورت نے اس مصنوعی آدمی کے لئے بھاپ چھوڑتے ہوئے قیمے کی ٹپڑانگ سے نکٹائی بنائی اور اسے اسکی گردن کے گرد کئی بار لپیٹا۔ اس کے بعد اس نے کتیا کی زنجیر کھول دی۔ کتیا اچک کر اس مصنوعی آدمی کی گردن پر جا پہنچی اور اس کے شانوں پر پنجے رکھ کر اسے چیر کر ٹکڑے ٹکڑے کرنا شروع کر دیا۔ وہ منہ میں ایک ٹکڑا لئے نیچے اتری مگر پھر اچھل کر اس پر چڑھ گئی اور اپنے دانت رسیوں میں گھسیٹ کر ٹکڑے نوچنے لگی اور پھر نیچے اتر آئی۔ لیکن جلد ہی غضبناک ہو کر دوبارہ

چڑھ گئی۔ اس نے دانتوں سے چہرے کو چیر کر رکھ دیا اور نوچ نوچ کر گردن کی دھجیاں اڑادیں۔

بوڑھی عورت خموشی کے ساتھ بلا حرکت یہ سب کچھ دیکھتی رہی اسکی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ اس نے کتیا کو دوبارہ زنجیر پہنا کر دو دن تک بھوکا رکھا اور اس عجیب و غریب عمل کو دہرایا۔

تین مہینوں میں اس نے کتیا کو اس کشمکش اور اپنے دانتوں اور پنجوں کے زور سے خوراک حاصل کرنے کا عادی بنا دیا۔ اب وہ اسے زنجیر نہیں پہناتی تھی بلکہ صرف اشارے سے مصنوعی آدمی کے اوپر چھوڑ دیتی تھی۔

اس نے مصنوعی آدمی کی گردن کے گرد کسی کھانے والی چیز کے نہ ہونے کی صورت میں بھی کتیا کو اسے چیر پھاڑ دینا سکھایا۔ اور وہ بعد میں کتیا کو اس کی خوراک بطور انعام دیتی تھی۔

جب بھی کتیا اس مصنوعی آدمی کو دیکھتی تو غرانا شروع کر دیتی اور اپنی مالکہ کی طرف دیکھتی۔ اس کی مالکہ انگلی اٹھا کر اسے "جاؤ" کہتی

جب اس نے سمجھ لیا کہ اب انتقام کے لئے موزوں وقت آگیا ہے تو وہ عبادت اور پادری کے پاس اعتراف کے لئے گئی۔ وہاں سے فارغ ہو کر اس نے مردانہ لباس پہنا اور ایک نحیف بوڑھا آدمی نظر آنے لگی۔ وہ سارڈینیا کے ماہی گیر کے پاس گئی جو اسے اور اسکی کتیا کو خلیج کی دوسری طرف لے گیا۔

اس کے پاس کپڑے کے تھیلے میں گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا تھا۔ کتیا دو دن سے بھوکی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بڑھیا اُسے گوشت سونگھا کر جوش دلاتی تھی۔ وہ لونگو سار دو نامی گاؤں میں داخل ہوئے۔ بڑھیا لنگڑاتی ہوئی چل رہی تھی۔ اس نے نانبائی کی دکان سے نکلس راولاتی کی رہائش گاہ کا پتہ پوچھا۔ وہ پہلے کی طرح اپنا بڑھئی کا کام ہی کرتا تھا اور اپنی دکان کے پیچھے اکیلا بیٹھا کام کر رہا تھا۔

بوڑھی عورت نے دروازہ کھول کر "ارے نکلس" کہا اور پھر کتیا کو کھلا چھوڑ کر کہا "جاؤ! جاؤ! اُسے کھا جاؤ! اُسے کھا جاؤ!

کتیا جوش میں آکر اس پر جھپٹ پڑی اور اسے حلق سے پکڑ لیا آدمی نے بازو پھیلا کر اُسے بھینچا اور فرش پر لڑھکنے لگا۔ کچھ لمحے وہ پیچ کھا کر زمین پر پاؤں مارتا رہا اور اس کے بعد بے حس و حرکت ہو گیا۔ کتیا اسکی گردن کو کھودتی رہی یہاں تک کہ اس کی دھجیاں اڑا دیں۔

دو ہمسایوں کو جب اپنے دروازوں کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے خوب یاد رہا کہ انہوں نے اس کی دکان میں سے ایک بڑھیا کو سیاہ کتیا کے ساتھ جو اپنی مالکہ کی عطا کی ہوئی بھورے رنگ کی کوئی چیز کھا رہی تھی باہر نکلتے دیکھا تھا۔

شام کو بوڑھی عورت اپنے گھر واپس آئی۔ اس رات

وہ بڑے آرام سے ہو گئی۔

چاندنی میں

پادری مارگنان واقعی "خدا کا سپاہی" کہلانے کا مستحق تھا۔ وہ ایک لمبا پتلا دُبلا سا آدمی تھا جو مذہب کی جنگ میں نمایاں، متعصب اور جوشیلا تھا۔ اس کے دل میں صداقت اور اعتقادات میں استقلال تھا۔ اسے شک چھو کر بھی نہیں گیا تھا وہ سمجھتا تھا کہ اس نے خدا کی معرفت حاصل کر لی ہے۔ گویا وہ اپنے خیال میں قادرِ مطلق کے ارادوں اور اسکی منشا کی اصل کو پہنچ چکا تھا۔ اسے دوسروں کی طرح تنہائی میں خدا

سے اپنی عقل کی نارسائی اور عجز کا اعتراف کا تجربہ نہ ہوا تھا۔ بلکہ وہ تو یہ کہتا تھا کہ میں خدا کا بندہ ہوں مجھے اس کے ہر کام کا سبب معلوم ہونا چاہیے اس کے خیال میں سب چیزیں منطق کے بہترین اصولوں کے مطابق تخلیق کی گئی ہیں۔ وہ ہر چیز کی علتِ غائی اور اسباب تخلیق میں ہم آہنگی محسوس کرتا تھا۔ صبح اس لئے پیدا کی گئی تھی کہ ہم بیدار ہوتے وقت خوشی محسوس کریں ہل اس لئے بنایا گیا تھا کہ ہماری کھیتی کو پکائے اور بارش اس لئے کہ اسے شاداب کرے۔ شام سونے کی تیاری اور رات ہمارے سونے کے لئے پیدا کی گئی تھی۔

چاروں موسم زراعت کی ضرورتوں کے لئے موزوں تھے اُسے کبھی اس بات کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ فطرت ارادہ نہیں رکھتی۔ اور کائنات کی تمام اشیاء نے مختلف زمانوں کی کیفیتوں، آب و ہوا اور مادہ سے اثر پذیر ہو کر موجودہ صورت اختیار کرلی ہے۔

اُسے عورتوں سے نفرت تھی اور اس نفرت میں اس کے ارادے کو دخل نہ تھا۔ وہ طبعاً انہیں حقیر سمجھتا تھا وہ اکثر حضرت مسیح کے ان الفاظ کو دہراتا تھا "عورت! مجھے تجھ سے کیا سروکار" بلکہ وہ تو یہ بھی کہتا تھا کہ خود خدا اپنی اس تخلیق سے خوش نہیں ہے عورت اس کے نزدیک بقول شاعر بارہ گنہ ناپاک تھی۔ حضرت آدم کو لالچ دلا کر بہکانے والی یہی تھی اور یہی اب تک انسانی تباہ کاریوں کا سبب ہے اس کی ذات نحیف گر خطرناک ہے۔ اور وہ

آدمی کو پراسرار دکھ دیتی ہے ۔ وہ اس کے زہریلے جسمانی حسن سے زیادہ اس کی محبت کرنے والی روح سے نفرت کرتا تھا۔ عورت کی ملائمت بارہا اس کے احساسات سے برسرِ پیکار ہوتی ۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو ناقابلِ تسخیر سمجھتا تھا تاہم وہ عورتوں کے چاہے جانے کی خواہش پر سخت برہم ہوتا تھا اس کے خیال میں خدا نے عورت کو مرد کی ترغیب و آزمائش کے لئے پیدا کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مردوں کو عورتوں کے نزدیک جانے سے پہلے تمام دفاعی تدابیر کر لینی چاہییں تاکہ ان کے حملوں سے محفوظ رہیں اس کا مقولہ تھا کہ عورت درحقیقت ایک پھندا ہے ۔ اس کے بازو اور لب مردوں کے لئے کشادہ ہیں ۔ وہ صرف راہبہ عورتوں کو ہی برداشت کر سکتا تھا ۔ جو صرف اس لئے بے ضرر تھیں کہ انہوں نے پاکیزگی کا عہد کر رکھا تھا ۔ مگر وہ تو ان بیچاریوں پر بھی سختی کرنے سے باز نہ آتا تھا ۔ کیونکہ ان کے زنجیروں میں جکڑے ہوئے دلوں میں بھی وہ ایک نرمی محسوس کرتا تھا ۔ جو اس کے پادری ہونے کے باوجود بھی اس کے دل پر اثر انداز ہوتی تھی ۔

اس کی ایک بھتیجی تھی جو کہ اپنی ماں کے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان میں قریب ہی رہتی تھی ۔ وہ اُسے بھی راہبہ بنانے پر مُصر تھا ۔ لڑکی خوبصورت ، ذہین ، اور شریر تھی ۔ جب پادری اُسے وعظ سناتا تو وہ ہنس دیتی ۔ جب وہ ناراض ہو جاتا تو اس کا منہ چوم لیتی تھی اور بغلگیر ہو جاتی تھی ۔ گو وہ غیر ارادی طور پر اپنا دامن چھڑاتا مگر اس کے باوجود اُسے باتوں سے ایک لذت محسوس ہوتی تھی ۔

اور اس کے اندر باپ بننے کا وہ جذبہ جاگ اٹھتا تھا جو ہر مرد کے دل میں خوابیدہ ہوتا ہے۔

وہ کھیت کی پگ ڈنڈیوں پر چلتے ہوئے اس سے خدا کے متعلق باتیں کرتا تھا۔ مگر وہ ان باتوں کی طرف دھیان نہ دیتی تھی بلکہ آسمان سبزہ اور پھولوں کی طرف مسرت حیات سے بھرپور ہو کر دیکھتی تھی کبھی وہ اڑتے ہوئے پروانوں کو پکڑنے کے لئے اس کے آگے دوڑتی تھی اور انہیں پکڑ کر اس کے پاس لاتی اور کہتی "دیکھو چچا جان یہ کس قدر خوبصورت ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اسے چوم لوں۔ تتلیوں اور پھولوں کو چومنے کی آرزو پادری کو برہم کرتی تھی کیونکہ اسے ان باتوں میں عورت کے دل کی ناقابلِ محو حرارت محسوس ہوتی تھی۔

ایک دن گرجا کی مقدس اشیاء کے محافظ کی بیوی نے جو کہ پادری کا گھر سنبھالے ہوئے تھی اسے کہا کہ اسکی بھتیجی کسی سے عشق لڑا رہی ہے۔ پادری اس وقت شیو کر رہا تھا اور اس کے منہ پہ صابن لگا ہوا تھا۔ وہ ایک دم بخود ہو کر کھڑا ہو گیا اور اس پر خوف طاری ہو گیا۔ جب اس کے حواس جمع ہوئے اور وہ بات کرنے کے قابل ہوا تو چلا کر بولا "یہ بالکل غلط ہے۔ تم جھوٹ بول رہی ہو میلانی"

لیکن دیہاتی عورت نے کہا "اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا سے پاؤں جب تمہاری بھاوج سو جاتی ہے تو وہ اس سے ملنے دریا کے کنارے چلی جاتی ہے

تم اسے رات کے دس اور بارہ بجے کے درمیان خود جا کر دیکھ سکتے ہو۔

پادری نے شیو بنانی چھوڑ دی اور کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ وہ اکثر پریشانی کی حالت میں ایسا ہی کرتا تھا۔ جب اس نے دوبارہ ڈاڑھی مونڈھنے کی کوشش کی تو ناک سے کان تک تین جگہ کاٹ ڈالا۔

تمام دن وہ غصّہ کی حالت میں خاموش رہا۔ محبت کی زبردست قوّت کے خلاف پادریانہ جدوجہد تو وہ کر ہی رہا تھا۔ اب اس میں وہ نفرت بھی پیدا ہو گئی جو ایک باپ، ایک استاد، اور ایک محافظ روح کے دل میں اخلاقی قدروں کے خیال سے پیدا ہوتی ہے۔ اسے ایسا صدمہ ہوا جیسا کہ ان والدین کو ہوتا جن کی لڑکی ان کی مرضی کے خلاف شادی کا اعلان کر دے

رات کے کھانے کے بعد اس نے پڑھنے کی ناکام کوشش کی مگر پڑھنے میں جی نہ لگا سکا اور ہر لمحہ اس کا غصّہ تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ جب رات کے دس بج گئے تو اس نے اپنی چھڑی اٹھائی یہ شاہ بلوط کی لکڑی کا ایک مضبوط ڈنڈا تھا۔ رات کو جب وہ کسی مریض کی عیادت کو جاتا تو وہ ڈنڈا اپنے پاس رکھتا تھا۔ اس نے ڈنڈے پہ نگاہ ڈالی اور اپنے مضبوط دیہاتی ہاتھ میں لے کر گھمایا اور ہوا میں خوفناک دائرے بنانے لگا پھر یکایک اس نے ڈنڈے کو بلند کر دیا اور دانت پیستے ہوئے ایک کرسی پہ دے مارا۔ کرسی کی پشت دو ٹکڑے ہو کر زمین پہ آ گری۔

اُس نے باہر نکلنے کے ارادے سے دروازہ کھولا۔ لیکن چاندنی رات کے دلکش اور نایاب منظر کو دیکھ کر حیرت سے دہلیز ہی پہ رُک گیا۔

چونکہ اسے وہ بلند رُوح عطا کی گئی تھی جو صرف سنہرے خواب دیکھنے والے شاعروں یعنی کلیسا کے بڑے پادریوں کو ہی ودیعت کی جاتی ہے اس نے محسوس کیا کہ دفعتاً اس کے دل میں رقت و گداز پیدا ہو گیا ہے۔ سنہری رات کی عظیم خوبصورتی کو دیکھ کر اس کا دل اس کے قابو سے نکل گیا تھا۔

اس کے چھوٹے سے باغیچہ میں پھلوں سے لدے ہوئے درخت چاند کی ملائم روشنی میں نہا کر قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ ان کی نازک شاخوں کا سایہ روشوں پہ پڑ رہا تھا۔ یہ شاخیں ابھی مکمل طور پر سبز نہ ہوئی تھیں۔ دیوار پہ پھیلی ہوئی زہر العسل کی بیل اپنی شیریں و کیف آور خوشبو پھیلا رہی تھی جو کسی معطر روح کی طرح رات کی شفاف اور حرارت افزا فضا میں محو پرواز تھی۔

وہ گہری سانسیں لینے لگا۔ وہ ہوا کو اس ذوق و شوق سے پی رہا تھا جیسے کہ شرابی شراب پیتے ہیں۔ وہ مست و سرشار خراماں خراماں چلنے لگا اور اس عالمِ بے خودی میں اپنی بھتیجی کو بھول گیا۔

جب وہ کھلے میدان میں پہنچا تو اس کی وسعت پہ غور کرنے لگا ہر طرف چاندنی بکھری ہوئی تھی رات سحر آفریں تھی مینڈک اپنی سر الاپ رہے

تھے۔ جذبات برانگیختہ کرنے والی روشنی میں بُلبلیں اپنے وہ حسین نغمے گھول رہی تھیں جنہیں سن کر انساں خوابوں کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ ان کے یہ رسیلے گیت بوسوں کی موسیقیت سے ہم آہنگ تھے۔

پادری سیر کرتا جا رہا تھا۔ اسکی ہمت پست ہوتی جاتی تھی۔ مگر اُسے اسکی وجہ معلوم نہ تھی۔ اس کو کمزوری اور تھکن کا احساس ہوا۔ اس کا دل چاہا کہ وہیں بیٹھ جائے اور خدا کی صنعتوں کی مدح سرائی کرے۔

اس کے سامنے دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ درختوں کی خم دار قطار تاحد نظر دکھائی دیتی تھی۔ پانی کی سطح کے اوپر بخارات کی سفید چادر تنی ہوئی تھی جسے چاند کی کرنیں چمکا رہی تھیں۔ پادری اس مقام پر رک گیا۔ اس کے دل میں جذبات کا تلاطم برپا تھا۔ یہ جذبات اس کی رُوح کی گہرائیوں میں اتر گئے تھے۔ اُسے تشکک اور مبہم بے چینی نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کے دل میں پھر وہی سوالات ابھر آئے جو وہ کبھی کبھی اپنے آپ سے کیا کرتا تھا۔

خدا نے ایسا کیوں کیا۔ رات جب سونے، بیخبری، آرام اور سب چیزوں کو فراموش کر دینے کے لئے بنائی گئی ہے تو پھر اُسے دن سے زیادہ دلکش طلوع و غروب سے زیادہ شیریں کیوں بنایا۔ پھر آہستہ خرام عشرت ریز چاند میں آفتاب سے زیادہ شعریت کیوں ہے۔ کیا اسے اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ

ننھی نازک اور پراسرار باتوں کو نمایاں کرے جنہیں سورج کی تمام تابناکیاں بھی پردۂ راز سے باہر نہیں لاسکتیں۔ وہ تاریکیوں میں اجالا کرنے کیوں نکلا ہے؟ تمام نغمہ سراؤں سے زیادہ شیریں گیت گانے والی بلبل دوسروں کی طرح آرام کیوں نہیں کرتی۔ وہ اس تکلیف دہ تاریکی میں کس کے لئے نغمہ سرا ہے؟ آخر دنیا پر یہ نصف حجاب کیوں ہے۔ دل میں یہ لرزشیں کس لئے ہیں اور روح کی بے قراری اور جسم کی پکار کا کیا مفہوم ہے۔

نفسانیت کا یہ مظاہرہ جسے انسان نیند کی وجہ سے نہیں دیکھ سکتا کیوں ہے۔ یہ عظیم منظر اور یہ شاعری کا سیلاب کس کے لئے آسمان سے اتر آیا ہے۔ پادری بے چارہ کچھ بھی تو نہ سمجھ سکتا تھا۔

دفعتہً چراہگاہ کے کنارے کہرے سے شرابور۔ چمکتے ہوئے درختوں کی محرابی چھت کے نیچے دو سائے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے نظر آئے۔

ایک سرو قد نوجوان نے اپنا بازو اپنی محبوبہ کی گردن میں حائل کر رکھا تھا اور وقتاً فوقتاً اس کی پیشانی کا بوسہ لیتا جاتا تھا انہوں نے اس بے جان منظر میں جوان کے گرد محیط تھا تازہ روح پھونک دی تھی۔ شاید قدرت نے اسے کھلے طور پران کی محبت کا پس منظر بنایا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ دونوں کا ایک ہی وجود ہے اور یہ خاموش اور پرسکون رات

ان ہی دونوں کے لئے تخلیق کی گئی ہے وہ پادری کے بہت قریب آگئے وہ خدا کی جانب سے اس کے سوال کا زندہ جواب تھے۔

وہ بغیر کسی جنبش کے کھڑا رہا۔ اس کا دل دھک کر رہا تھا۔ اس نے اسے انجیل میں لکھی ہوئی اس کہانی کا ایک منظر سمجھا جس میں حسین وجمیل روتھ اور بوز کی لازم محبت کا ذکر ہے۔ گویہ جوڑا اس دلکش فضا میں رضائے خداوندی کی تکمیل کر رہا تھا۔ اس کے دماغ میں نغمۂ نغمات کے وہ اشعار گردش کرنے لگے۔ جن میں شدتِ جذبات اور جسم کی پکار ہی شاعری کی روحِ رواں ہیں۔ اس نے اپنے دل سے کہا کہ یہ راتیں خدا نے اس لئے بنائی ہیں کہ انسانی محبت کو منشائے الٰہی کی حسین و جمیل چادر اڑھا دے۔

وہ اس جوڑے کی راہ سے جو ہاتھ میں ہاتھ دیئے چلا جا رہا تھا، ہٹ گیا۔ حقیقت میں وہ حسینہ اس کی بھتیجی تھی۔ اب تو وہ خود اپنے آپ سے یہ سوال کر رہا تھا، کہ وہ کہیں خدا کی نافرمانی تو نہیں کر رہا تھا۔ کیونکہ خدا تو محبت کی اجازت دیتا ہے۔ کیونکہ وہ محبت کو اس قدر شاندار پس منظر سے نوازتا ہے۔

وہ شرم وحیرت کے جذبات لئے ہوئے وہاں سے بھاگ

نکلا گویا کہ وہ اس حریم قدس میں داخل ہوگیا تھا جہاں جانے کا اسے کوئی مستحق نہ تھا۔

بہار میں

جب بہار کے حسین دن آتے ہیں تو سوئی ہوئی زمین جاگ کر سبز لباس پہن لیتی ہے خوشبو سے بسی ہوئی ہوا ہمارے چہروں سے پیار کرتی ہے یہ جاں افروز ہوا ہمارے پھیپھڑوں کو پر کرتی ہوئی ہمارے دلوں کی تہ میں اتر جاتی ہے۔ ہم ایک غیر متعین مسرت کی ایک مبہم سی آرزو

اور بے مقصد پھرنے کی خواہش محسوس کرتے ہیں تاکہ روحِ بہار کو اپنے اندر سمو لیں پچھلے سال چونکہ کڑاکے کی سردی پڑی تھی اس لئے اب کے مئی میں موسمِ بہار کی آمد پر اس خواہش نے ایک کیف انگیز جذبے کی صورت اختیار کر لی۔

ایک صبح میں نے بیدار ہوتے ہی کھڑکی میں سے نیلگوں آسمان پہ نگاہ ڈالی جو مکانوں کے اوپر ارغوانی نور بکھیر رہا تھا۔ اس وقت پرندے کھڑکیوں پہ بیٹھے بلند آواز سے بہار کے ترانے گا رہے تھے۔ خوش پرندے ترنم ریزیاں کر رہے تھے۔ نیچے بازار میں لوگوں کی مسرت آمیز آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میرا دل اس ضیا پاش دن کی طرح روشن تھا۔ میں اٹھا اور چل پڑا ——— نہ معلوم کدھر؟
میں نے راستے میں ہر شخص کو شاداں و فرحاں پایا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ موسمِ بہار کی آمد پہ ہر ایک چیز میں مسرت سرایت کر گئی ہے ان دنوں شہر میں عشق و محبت کی ہما ہمی چل رہی تھی۔ نوجوان عورتیں جن کی آنکھوں کی گہرائیوں میں محبت جھلک رہی تھی۔ جب دلکش انداز سے صبح کا لباس زیبِ تن کئے مستانہ انداز سے محوِ خرام ہوتیں تو میرے دل میں جذبات کا طوفان اٹھتا تھا۔ میں نے خود کو دریائے سین کے کنارے پایا۔ مجھے خبر نہیں، میں وہاں کیوں اور کیسے پہنچ گیا۔ دخانی کشتیاں

شہر سوغنے کو روانہ ہوا چاہتی تھیں ۔ میرے دل میں جنگل کی سیر کی ناقابلِ تسخیر خواہش پیدا ہوئی ۔ کشتی کے عرشہ پہ مسافروں کا ہجوم تھا۔ کیونکہ موسمِ بہار کی خوشگوار حرارت لوگوں کو گھروں سے باہر نکلنے پر اکساتی ہے ۔ ہر شخص متحرک تھا لوگ ایک دوسرے سے مل رہے اور آپس میں گپ لڑا رہے تھے ۔ کشتی میں میرے قریب ایک عورت بیٹھی تھی ——— عورت نہیں بلکہ ایک خوبصورت محنت و مشقت کرنے والی لڑکی تھی ۔ اس میں پیرس کی حسینہ کی سی حقیقی دلکشی تھی ۔ اس کا سر قدرے چھوٹا تھا ۔ سر پر چمکیلے گھنگھریالے بال تھے جو کانوں کی لوؤں کو چھوتے ہوئے اس کی گردن پہ لہرا رہے تھے ۔ جب ہوا چلتی تو یہ بھی ایک دلکش انداز کے ساتھ رقص کرنے لگ جاتے ۔ اور اس وقت یہ اتنے عمدہ اور دلکش معلوم ہوتے تھے کہ جی چاہتا تھا کہ ان پہ بوسوں کی بوچھاڑ کر دی جائے ۔

میری نگاہوں کی کشش نے اس کے چہرے کا رخ میری طرف کر دیا ۔ پھر اس نے جلدی سے نظر جھکا لی ۔ اس کا ہلکا سا غبغب رخسار اس کے نفیس سنہری روئیں نمایاں کر رہا تھا جن پہ سورج اپنا مہین سا ملمع چڑھا رہا تھا ۔

خاموش دریا وسیع تر ہوتا گیا ۔ فضا میں ایک خوشگوار حرارت

اور سکون کامل تھا۔ مگر خلائے بسیط صدائے حیات سے پُر معلوم ہوتی تھی۔ میری ہمسایہ لڑکی نے نگاہیں اونچی کیں میں مسلسل اُسے دیکھ رہا تھا۔ اب کی دفعہ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔ وہ بے حد حسین تھی میں نے اس کی مختصر نگاہ کی اتھاہ گہرائیوں میں وہ تمام شعریت جو ہمارے خوابوں کو دلفریب بناتی ہے۔ اور وہ مسرت جسے ہم کوشش پیہم کے ساتھ تلاش کرتے ہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی اس سرسری نگاہ میں میں نے وہ ہزاروں دلفریبیاں دیکھیں جن سے میں اب تک ناآشنا تھا میرے دل میں دیوانہ وار یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر کہیں دور لے جاؤں اور اس کے کانوں میں محبت کے شیریں نغموں کا رس گھول دوں۔

میں اس سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ کسی نے میرے کاندھے کو چھُوا۔ میں نے حیرت سے پلٹ کر دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر کا معمولی وضع قطع کا انسان حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا "میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"

میں نے غصّہ سے اسکی طرف دیکھا تو اس نے کہا "بڑی اہم بات ہے" میں اٹھ کر کشتی کی دوسری جانب اس کے پیچھے چلا گیا اس نے کہا "جب موسم سرما شدید سردی اور برفیلی ہوا کے ساتھ آتا

ہے تو ڈاکٹر صاحبان ہر شخص کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ اپنے پاؤں گرم رکھے سردی پھیپھڑوں کے ورم، وجع المفاصل اور ذات الصدر سے اپنے آپ کو بچائے ۔ ہم معمول سے زیادہ احتیاط برتتے ہیں ہم فلالین کے کپڑے گرم کوٹ اور موٹے موٹے جوتے پہنتے ہیں پھر بھی ہمیں دو دو ماہ زیادہ وقت بستر ہی میں گذارنا پڑتا ہے جب موسم بہار سر سبز پتوں پھولوں، نرم ہوا اور مہکتے ہوئے کھیتوں کے جلو میں آتا ہے تو ہم اپنے جسم عجیب سی بے چینی اور بے سبب شدت جذبات محسوس کرتے ہیں ۔ اس وقت ہم سے کوئی نہیں کہتا " موسیو! محبت سے بچو! وہ ہر طرف گھات لگائے بیٹھی ہے ۔ وہ ہر کونے میں چھپی ہوئی تمہاری راہ تک رہی ہے ۔ اس نے اپنے تمام جال بچھا رکھے ہیں اور اپنے ہتھیار تیز کر لئے ہیں ۔ وہ اپنی تمام فریب کاریوں سے لیس ہے ۔ محبت سے بچو! ہاں محبت سے بچو! یہ سردی اور ذات الصدر سے زیادہ خطرناک ہے ۔ یہ کبھی معاف نہیں کرتی اور ناقابلِ تلافی نادانیوں کے ارتکاب پر مجبور کرتی ہے ۔

ہاں موسیو! حکومتِ فرانس کو چاہیے کہ وہ دیواروں پر بڑے بڑے اشتہار چسپاں کر دے جن میں لکھا ہو "بہار کی آمد فرانس کے شہریو! محبت سے خبردار رہو!

چونکہ حکومت یہ کام نہیں کرے گی اس لیے یہ فرض مجھے ہی ادا کرنا ہوگا۔ اور میں تمہیں تنبیہ کرتا ہوں کہ محبت سے بچو۔ وہ تمہیں پھانسنے کے لئے تیار بیٹھی ہے۔ اور میرا فرض ہے کہ تمہیں مطلع کر دوں جیسے دس میں ہر اس شخص کو جس کی ناک منجمد ہو جائے مطلع کر دیا جاتا ہے۔

مجھے اس شخص پر سخت حیرت ہوئی میں نے باوقار انداز میں کہا "موسیو تم اپنے معاملے میں دخل دے رہو جس میں دخل دینے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔"

اس نے اپنے آپ کو اچانک جنبش دیتے ہوئے جواب دیا:

"موسیو موسیو اگر میں کسی شخص کو کسی خطرناک مقام پر ڈوبتے ہوئے دیکھوں تو کیا مجھے یہ چاہیے کہ اُسے ڈوبنے دوں؟ لو میری کہانی سنو۔ تمہیں خود بخود پتہ چل جائے گا کہ میں نے تم سے ہمکلامی کی جرأت کیوں کی؛

"یہ واقعہ گذشتہ سال اسی موسم میں پیش آیا۔

میں بحری فوج کے محکمہ میں کلرک ہوں۔ میں اپنے دفتر میں ہی نیلے سمندر اور ابابیلوں کا نظارہ کر سکتا تھا اور فائلوں کے درمیان بیٹھے ہوئے بھی میرے دل میں رقص کرنے کی تمنا پیدا ہوتی تھی۔ ایک دن میرے دل میں آزادانہ پھرنے کی اس قدر تیز خواہش پیدا ہوئی کہ میں اپنی مرضی کے خلاف اپنے پست قامت بدمزاج اور سٹریل افسر کے پاس

رخصت لینے کے لئے چلا گیا جب میں نے علالت کا عذر پیش کیا تو اس نے کہا "مجھے تمہاری بات کا اعتبار نہیں ہے۔ لیکن تم جا سکتے ہو۔ کیا کوئی دفتر تمہارے جیسے کلرکوں کی موجودگی میں چل سکتا ہے؟" میں فوراً دریائے سین پر چلا آیا۔ وہ دن بھی آج کی طرح خوشگوار تھا۔ میں کشتی میں سیر کرتا ہوا سینٹ کلاؤڈ کی طرف چل نکلا۔ آہ کیا ہی اچھا ہوتا۔ کہ اگر میرا افسر اس دن مجھے دفتر سے باہر جانے کی اجازت نہ دیتا۔ میں خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ کشتی دریا درخت مکانات اور میرے ہمسفر سبھی پر مجھے پیار آ رہا تھا۔ میرے دل میں کسی چیز کو بوسہ دینے کی امنگ پیدا ہو رہی تھی۔ خواہ کوئی چیز ہی ہو! ..... محبت اپنا جال پھیلا رہی تھی۔ تروکاڈیرو کے مقام پہ پارسل ہاتھ میں لئے کشتی پر سوار ہوئی اور میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ یقیناً خوبصورت تھی۔ مگر موسیو! یہ عجیب بات ہے کہ بہار کے خوشگوار موسم میں ہمیں عورتیں کس قدر حسین تر معلوم ہوتی ہیں۔ ان دنوں ان کا حسن نشہ کی سی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور ہمیں ان کے دیکھنے میں وہی سرور ملتا ہے جو پنیر کھانے کے بعد شراب پینے سے ملتا ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور اس نے میری طرف۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس لڑکی نے ابھی تمہاری طرف دیکھا ہے۔ بارہا ایک دوسرے کو دیکھ لینے کے بعد میں نے سوچا کہ گفتگو کے آغاز کے لئے اس

قدر آشنائی کافی ہے۔ میں نے اس سے کچھ کہا تو اس نے بھی میری بات کا جواب دیا۔ وہ یقیناً خوبصورت اور پیاری تھی۔ موسیو اس نے میرے جذبات کو بھڑکا دیا۔

وہ سینٹ کلاوڈ پہنچ کر کشتی سے اتری۔ میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ جب وہ پارسل دے کر واپس آئی تو کشتی روانہ ہو چکی تھی میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اور ہم دونوں ہوا کی تاثیر سے آہیں بھرنے لگے۔

"جنگل کا سماں بہت پر لطف ہو گا" میں نے کہا

"یقیناً۔ ایسا ہی ہو گا" اس نے جواب دیا۔

"کیا ہم وہاں سیر کے لئے چلیں، موازیل" میں نے کہا

اس نے تیزی سے میری طرف دیکھا، گویا وہ جاننا چاہتی تھی کہ میں کیسا ہوں۔ کسی قدر تامل کے بعد اس نے میری تجویز قبول کر لی اور ہم جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔ ہم پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ جھڑے ہوئے پتوں کی باریک تہ کے نیچے لمبی گھنی اور چمکیلی سبز گھاس پہ سورج کی روشنی کا سیلاب موجزن تھا۔ چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے باہم اختلاط کر رہے تھے۔ ہر طرف طیور نغمہ سرا تھے میری رفیقہ سبزے کی بو اور ہوا کی تاثیر سے بدمست ہو کر اچھلنے کودنے لگی اور میں بھی اس کے پیچھے اچھلنے

کودنے لگا۔ آہ موسیو! بعض اوقات ہم کس قدر نادان ہو جاتے ہیں!

اِس نے عالمِ وارفتگی میں ہزاروں نغمے گائے۔ اوپرا کی دھنیں اور میوزیٹ کا گیت! آہ میوزٹ کا گیت۔ اس وقت اس گیت میں کس قدر شعریت محسوس ہوتی تھی۔ میں اسے سن کر بھڑک اٹھا تھا۔ اس طرح کے احمقانہ گیت ہمیں پاگل بنا دیتے ہیں۔ میری نصیحت مانو اور کبھی اس عورت سے شادی نہ کرو جو سبزہ زار میں گانا گائے۔ اس عورت سے خاص طور پر جو میوزٹ کا گانا گائے۔

وہ جلد ہی تھک کر سرسبز ڈھلان پر بیٹھ گئی۔ میں بھی اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے۔ ان پر سوئی چبھنے کے نشانات دیکھ کر میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ یہ مشقت کے مقدس نشان ہیں۔ آہ موسیو! کیا تم جانتے ہو کہ یہ مقدس نشانات کس چیز کی غمازی کرتے ہیں؟ وہ کارخانے کی فضول بکواس، معصیت آموز سرگوشیوں اور گندے ذہن کی نشان دہی کرتے ہیں۔ وہ عصمتِ دریدہ، یاوہ گوئی، عاداتِ قبیحہ اور نیچے طبقے کی عورت کی تنگ نظری کی حکایت سناتے ہیں۔

ہم کچھ دیر ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ آہ عورت کی آنکھ میں کس قدر جاذبیت ہوتی ہے۔ یہ ہمیں برانگیختہ

کرتی ہے۔ پھر ہم پر حملہ آور ہوتی ہے۔ ہمیں اپنی گرفت میں لیکر مسخر کر لیتی ہے۔

یہ جاذبیت کس قدر عمیق اور پیمانِ فرد اسے پُر معلوم ہوتی ہے! لوگ اسے ایک دوسرے کی روح میں جھانک کر دیکھ لینے سے موسوم کرتے ہیں۔ آہ موسیو! یہ کتنا بیہودہ خیال ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے کی روحوں کا حال معلوم کر سکتے تو ہم اپنے اعمال میں زیادہ احتیاط برتتے۔ بہر حال میں اسکی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا اور اس کے عشق میں دیوانہ ہو رہا تھا میں نے اُسے اپنی آغوش میں لینے کی کوشش کی۔ مگر اس نے کہا "ہاتھ پیچھے ہٹائیے" یہ سُن کر میں اس کے قدموں میں گر پڑا اور اُسے ماجرائے دل کہہ سنایا اور اس کے گھٹنوں پر سر رکھدیا۔ وہ حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگی گویا وہ یہ کہہ رہی تھی۔ "یونہی عورتیں مردوں کو بیوقوف بناتی ہیں، اچھا دیکھا جائے گا" موسیو! بازارِ محبت میں مرد محض فنکار ہوتے ہیں۔ مگر عورتیں بیوپاری کا کردار ادا کرتی ہیں۔

بے شک میں اُسے حاصل کر سکتا تھا۔ مجھے بعد از وقت اپنی حماقت کا علم ہوا۔ مجھے عورت کے جسم کی ضرورت نہ تھی۔ مجھے تو محبت کی آرزو تھی۔ میں اس وقت محض جذبات کی رو میں بہ رہا تھا حالانکہ مجھے یہ وقت بہتر مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہیئے تھا۔

جب وہ میرے اظہارِ محبت کے بیان سے سیر ہو گئی تو اٹھ کھڑی ہوئی اور ہم دونوں سینٹ کلاؤڈ میں واپس آ گئے میں پیرس تک اس کے ساتھ رہا۔ میں نے اسے اداس پا کر پوچھا "کیا بات ہے"؟ اس نے کہا "میں سوچ رہی ہوں کہ آج کا دن ان خوشگوار دنوں میں سے ہے جو ہماری زندگی میں بہت ہی کم آتے ہیں" یہ سن کر میرا دل اس قدر زور سے دھڑکا کہ یوں معلوم ہوا کہ میری پسلیاں ٹوٹ جائیں گے۔ میں اگلی اتوار اس سے ملا اور اس کے بعد ہر اتوار اسے ملتا تھا۔ میں اُسے سینٹ جرمیں میزوں لافٹ۔ پواسی اور اسی طرح کی دوسری سیر گاہوں میں لئے پھرتا تھا جہاں محبت کرنے والے جوڑے اکثر پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ فریب کار بھی مجھے محبت کا جُل دیتی رہی یہاں تک کہ تین مہینے کے اندر اندر میں اس قدر مقتول ہو گیا کہ اس سے شادی کر بیٹھا۔ موسیو! جب آدمی معمولی کلرک ہو۔ اور تنہا زندگی بسر کر رہا ہو اور اسکو سمجھانے والا کوئی رشتہ دار یا دوست بھی نہ ہو تو تم اس کی حالت کا خود ہی اندازہ کر سکتے ہو۔

میں نے یہ سمجھ کر کہ بیوی زندگی کو حسین بنا دے گی شادی تو کر لی۔ مگر اب وہ محبوبہ بیوی بن کر مجھے دن رات گالیاں دیتی ہے۔ وہ کچھ سمجھتی سمجھتی نہیں۔ مسلسل بکواس کرتی ہے۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر گانے گاتی

ہے۔ موزیٹ کے گانے جو ہر سننے والے کو بیزار کر دیتے ہیں۔ وہ نوکر سے جھگڑتی ہے اور دربان کو خانگی حالات بتلاتی ہے۔ بستر عروسی کے راز ہمسائے کی خادمہ کو سنانے جاتی ہے۔ اپنے خاوند کی باتیں دکانداروں کو بتاتی ہے۔ اس کا دماغ بیہودہ کہانیوں توہم پرستیوں اور تعصبات سے پُر ہے۔

یہ کہکر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور اس پر رقت طاری تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو مجھے اس کی حالت پر رحم آیا۔ میں اُسے کوئی جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ کشتی رکی۔ ہم سینٹ کلاوڈ کے شہر میں تھے۔

جس لڑکی پر میں فریفتہ ہو رہا تھا۔ کشتی سے اترنے کے لئے اٹھی اس نے میرے قریب سے گذرتے ہوئے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ یہ وہ مسکراہٹ تھی جو آدمی کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ پھر وہ ساحل پر اترنے لگی میں اس کے پیچھے جانے کے لئے لپکا۔ مگر میرے ساتھی نے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے بازو چھڑایا تو اس نے میرا کوٹ پکڑ لیا اور مجھے کھینچتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔ میں تمہیں جانے نہ دوں گا"

اس نے یہ اتنی اونچی آواز سے کہا کہ ہر شخص دیکھ کر ہنسنے لگا۔ میں بلا حرکت کھڑا رہا۔ مجھے سخت طیش آ رہا تھا مگر میں بدنامی اور تضحیک کے ڈر سے

آگے نہ بڑھ سکتا تھا۔ اسی حالت میں کشتی چل پڑی۔ وہ عورت ساحل پر کھڑی میری مایوسی کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ میرے ساتھی نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے میرے کان میں کہا۔" تمہیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ میں نے تمہاری بہت بڑی خدمت کی ہے۔

چڑیل

ایک سفید ریش بوڑھے نے ہم سے بھیک مانگی۔ میرے ساتھی نے جس کا نام جوزف داورانش تھا اُسے پانچ فرانک دیئے تو میں حیران رہ گیا۔ جوزف نے کہا یہ غریب بوڑھا مجھے ایک واقعہ کی یاد دلاتا ہے۔ سنیئے:

"میرا خاندان جو شہر آور سے تعلق رکھتا تھا، کوئی امیر گھرانہ نہ تھا

البتہ گزارہ ہو جاتا تھا، میرا باپ سخت محنت کرتا وہ دفتر سے دیر میں گھر لوٹتا تھا اور اس کی آمدنی قلیل تھی۔ میری دو بہنیں تھیں، ہمارے محدود وسائل میری ماں کے لئے تکلیف کا باعث تھے۔ اور وہ اپنے خاوند کو اشاروں کنایوں میں ملامت کرتی رہتی تھی۔ میرا غریب باپ اس موقع پر جو اشارہ کرتا تھا وہ مجھے اذیت پہنچاتا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھ لیتا تھا گویا وہ پسینہ پونچھ رہا ہو حالانکہ اس کی جبیں پر کوئی پسینہ نہ ہوتا تھا۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑتا۔ مجھے اس کی مجبوری اور بے بسی کا شدید احساس ہوتا تھا۔ ہم بڑی کفایت شعاری کرتے تھے یہاں تک کہ کوئی دعوت بھی اس خیال سے قبول نہ کرتے تھے کہ ہمیں بھی جواباً اپنے ہاں انہیں دعوت پر بلانا پڑے گا۔ ہم دکانوں کا بچا کھچا سودا رعائتی قیمت پر خریدتے تھے میری بہنیں اپنا لباس خود سی لیتی تھیں اور معمولی قیمت کے کپڑے کی خرید پر بھی کافی لے دے ہوتی تھی۔ ہماری خوراک شوربا، گائے کا گوشت اور چٹنی کے سوا کچھ نہ تھی۔ ممکن ہے یہ غذا صحت بخش ہو، مگر میں تو کسی بھی کھانے کو اس پر ترجیح دیتا تھا۔ اگر کوئی بٹن گم ہو جاتا یا پتلون پھٹ جاتی تو آفت برپا ہو جاتی تھی۔

اتوار کے دن ہم اپنے بہترین لباس میں سیر کے لئے نکلتے تھے، میرا باپ کوٹ، ہیٹ اور دستانے پہنے میری ماں

کے بازو میں بازو ڈال کر چلتا- میری ماں ایسے سجی ہوتی تھی جیسے تہوار کے موقع پہ جہاز سجا ہوتا ہے- میری بہنیں سب سے پہلے تیار ہوتیں اور جانے کی منتظر رہتیں مگر عین وقت پہ میرے باپ کے کوٹ پر کوئی دھبہ نظر آجاتا جسے جلدی سے صاف کرنا پڑتا تھا- میری ماں عینک لگائے اپنے دستانے اتار کر دھبہ مٹانے میں عجلت سے کام لیتی اور میرا باپ قمیض پہنے، سر پہ ہیٹ رکھے منتظر رہتا-

ہم بڑے تکلف سے روانہ ہوتے، میری بہنیں آگے آگے ایک دوسرے کا بازو تھامے چلتیں- ان کی شادی کی عمر ہو چکی تھی- اس لئے ان کی نمائش ضروری تھی- میں اپنی ماں کی بائیں جانب اور میرا باپ اس کی دائیں جانب ہوتا تھا- میرے غریب والدین کا پُر شوکت انداز، ان کے چہرے کی متانت اور ان کی سنجیدہ رفتار جو اتوار کے دن کی سیر کی خصوصیت تھی مجھے اب تک یاد ہے- وہ آہستہ آہستہ چلتے تھے، سنجیدگی کا اظہار کرتے ہوئے- ان کے جسم بالکل ستواں ہوتے اور ان کی ٹانگیں اکڑی ہوتی تھیں گویا کسی بہت ہی اہم بات کا ان کی شکل و شباہت پر انحصار تھا- ہر اتوار دور دراز ممالک سے آنے والے سمندری جہازوں کو دیکھ کر میرا باپ یہ بات ضرور کہتا تھا-

"کیسی عجیب بات ہو اگر جُیل اس جہاز پر سے اترے"

میرا چچا پُل خاندان کی واحد اُمید تھا اگرچہ وہ اس سے پہلے گھر والوں کے لئے خوف کا باعث تھا۔ میں نے بچپن ہی سے اس کے متعلق بہت کچھ سننا شروع کیا تھا اس لئے میں سمجھتا تھا کہ اُسے دیکھتے ہی پہچان لوں گا۔ مجھے اس کے آغازِ زندگی سے امریکہ جانے تک کی تمام تفصیلات معلوم تھیں اگرچہ ان میں سے کچھ باتیں چھپا کر رکھی جاتی تھیں۔

معلوم ہوتا ہے اس نے ڈھنگ سے زندگی نہیں گذاری تھی اس نے کچھ رقم فضول خرچی میں ضائع کی تھی اور ایک غریب خاندان کے فرد کے لئے ایسا کرنا سنگین ترین جرم ہے۔ امیر آدمی کے لئے تو یہ عیاشی ہے۔ مگر ایک نوجوان جو غریب والدین کا سرمایہ برباد کر دے ناکارہ اور بدمعاش سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ امتیاز بالکل درست ہے۔ کیونکہ اعمال کو ان کے نتائج ہی سے پرکھا جاتا ہے۔ میرے چچا پل نے وراثت میں سے اپنا حصہ ختم کر کے میرے باپ کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا تھا اور اُسے اس زمانے کے دستور کے مطابق سامان بردار بحری جہاز پہ امریکہ بھیج دیا گیا تھا۔

وہاں پہنچ کر وہ مختلف اشیا کی فروخت کا کام کرنے لگا اور اس نے ہمیں لکھا کہ وہ میرے باپ کے نقصان کی عنقریب تلافی کر دے گا۔ اس خط نے خاندان بھر میں کھلبلی مچادی۔ پُل جو اس وقت

ناکارہ سمجھا جاتا تھا اب خاندان کے باقی لوگوں کی طرح نیک رحمدل اور دیانت دار انسان تصور ہونے لگا۔ ہمیں ایک کپتان نے بتایا کہ اُس نے جہاز کرایہ پہ سے کر بہت اچھا کاروبار شروع کر رکھا ہے۔ دو سال بعد اس کا دوسرا خط آیا جس میں لکھا تھا: "میرے پیارے فلپ۔ میری صحت کی فکر نہ کرو۔ میں بہت خوش و خرم ہوں۔ میرا کاروبار خوب چل رہا ہے۔ کل میں جنوبی امریکہ کے دورے پر جا رہا ہوں میں کئی سال باہر رہوں گا، اور تمہیں خط نہیں لکھ سکوں گا۔ مگر تم فکر نہ کرنا۔ میں خوب دولت کما کر وطن واپس لوٹوں گا۔ مجھے اُمید ہے ایسا ہونے میں دیر نہیں لگے گی اور ہم سب بہت جلد مزے اور عیش سے زندگی بسر کریں گے"

یہ خط خاندان کے لئے صحیفۂ آسمانی بن گیا۔ اسے موقع بموقع پڑھا جاتا تھا اور ہر شخص کو دکھایا جاتا تھا دس سال تک چچا ٹیل کے متعلق کوئی خبر نہیں ملی۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا میرے والد کی اُمیدیں بڑھتی گئیں اور میری ماں بھی اکثر کہا کرتی:

"جب اچھا ٹیل یہاں آئے گا تو ہماری حالت بہت بہتر ہو جائے گی وہ زندگی گذارنا جانتا ہے"

اور ہر اتوار کو سیر کرتے ہوئے جب وہ دُور افق سے دھوئیں کے بادل چھوڑتے ہوئے ساحل کی طرف آتے جہازوں کو دیکھتا تو اپنا

ابدی فقرہ دہراتا :

"کتنی عجیب بات ہو اگر یل اس جہاز سے اترے" اسے امید تھی کہ یل جہاز پر سے اپنا رومال ہلا کر دور سے اُسے "ہیلو فلپ" کہکر پکارے گا۔

اس کی واپسی کی اُمید پر ہزاروں سکیمیں بنائی گئیں۔ چچا کی دولت سے ہم اپنے لئے ایک اچھا سا گھر خریدنا چاہتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ میرے باپ نے پہلے ہی سے مکان کا سودا کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری بڑی بہن کی عمر اٹھائیس سال اور چھوٹی کی چھبیس سال تھی اور ان کا غیر شادی شدہ ہونا خاندان کے لئے تکلیف کی بات تھی۔ بالآخر ایک کلرک نے چھوٹی کا رشتہ مانگا۔ وہ اگرچہ دولتمند نہیں تھا تاہم معزز آدمی تھا۔ مجھے یقین ہے کہ چچا یل کے خط نے جو اُسے ایک شام دکھایا گیا تھا اسے رشتہ مانگنے پر آمادہ کیا تھا۔ رشتہ منظور کر لیا گیا اور یہ طے پایا کہ شادی کے بعد تمام گھرانہ جرسی کے علاقے میں سیر کے لئے جائے گا۔ جرسی غریب لوگوں کے لئے بڑی موزوں سیرگاہ ہے کیونکہ یہ دُور نہیں ہے۔ جہاز میں تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے سے انسان اس سرزمین غیر میں جا پہنچتا ہے۔ یہ چھوٹا سا جزیرہ برطانیہ کی ملکیت ہے۔ فرانسیسی صرف دو گھنٹے کے سمندری سفر کے بعد اپنے ہمسایہ ملک کے باشندوں اور

ان کی رسوم کا مشاہدہ کر سکتے ہیں بحر سی کی سیر کا خیال ہمارے دل و دماغ پر چھا گیا اور ہماری تمام توقعات کا مرکز بنا رہا۔ آخر ہماری روانگی کا دن بھی آ ہی گیا۔ یوں معلوم ہے جیسے کل کی بات ہے۔ جہاز بھاپ چھوڑ رہا تھا۔ میرا باپ گھبراہٹ کے عالم میں کشتی پر سامان رکھوا رہا تھا۔ میری مضطرب ماں میری غیر شادی شدہ بہن کا بازو تھامے ہوئے تھی کیونکہ چھوٹی بہن کی شادی کے بعد بڑی کچھ کھو سی گئی تھی۔ ہمارے پیچھے دلہا دلہن آ رہے تھے جو ہمیشہ پیچھے ہی رہ جاتے تھے اور مجھے اُنہیں مڑ مڑ کے دیکھنا پڑتا تھا۔

سیٹی بجی تو ہم جہاز میں سوار ہوئے۔ جہاز نے ساحل کو چھوڑا اور سنگ مرمر کی میز کی طرح ہموار سمندر میں گامزن سفر ہوا۔ ہم کم سفر کرنے والوں کی طرح خوشی اور فخر سے دور ہٹتے ہوئے ساحل کو دیکھ رہے تھے۔ میرا باپ سینہ تانے ہوا میں گہرے سانس لے رہا تھا وہ اس کوٹ میں ملبوس تھا جسے صبح بڑی اچھی طرح صاف کیا گیا تھا۔ اس کے کوٹ سے دھبہ دور کرنے والی دوائی کی بُو آ رہی تھی۔ یہ بُو مجھے اتوار کا یاد دلاتی ہے۔ اچانک اس نے دو آدمیوں کو خوش پوش عورتوں کو مونگے پیش کرتے ہوئے دیکھا۔

ایک بوڑھا ملاح پھٹے پرانے کپڑے پہنے چاقو سے انہیں کھول کر آدمیوں کو دے رہا تھا اور وہ اس سے لے کر عورتوں کو پیش کر رہے تھے وہ انہیں بڑی نفاست سے کھا رہی تھیں۔ وہ انہیں رومال سے پکڑ کر منہ

آگے بڑھا کر کھا رہی تھیں تاکہ کپڑے خراب نہ ہوں۔ وہ مشروب کو جلدی سے پی کر خول پھینک دیتی تھیں۔

میرے باپ کو چلتے جہاز پر اس نفاست سے مونگے کھانا بہت بھایا۔ اس نے اسے عمدہ سمجھتے ہوئے میری ماں اور بہنوں سے جا کر پوچھا "کیا میں آپ کو مونگے پیش کر سکتا ہوں؟" میری ماں اخراجات کا خیال کرتے ہوئے جھجک گئی مگر میری بہنوں نے فوراً یہ پیشکش قبول کر لی۔ میری ماں نے ناراضگی سے کہا۔

"میرا تو ان کے کھانے سے پیٹ خراب ہو جاتا ہے بچوں کو لے دیجئے۔ مگر انہیں زیادہ نہ کھانے دیجئے۔ ورنہ بیمار ہو جائیں گے۔" پھر میری طرف دیکھ کر بولی "جوزف کو ان کی ضرورت نہیں، لڑکوں کو خراب نہیں کرنا چاہیئے" میں اپنی ماں کا یہ امتیازی سلوک ناانصافی گردانتے ہوئے اس کے پاس ہی کھڑا رہا میں نے دیکھا کہ میرا باپ اپنے داماد اور دو بہنوں کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ اس خرقہ پوش ملاح کے پاس لئے جا رہا تھا۔

ان دو معزز خواتین کو گئے ہوئے بہت تھوڑا عرصہ ہوا تھا میرا باپ میری بہنوں کو بغیر مشروب گرائے کھانے کا طریقہ تبلا رہا تھا۔ اس نے ان کو ایک عملی مثال دینے کی بھی کوشش کی۔ اس نے ان معزز خواتین کی نقالی کی اور تمام مشروب اپنے کوٹ پر گرا لیا۔ میں نے اپنی ماں کو کہتے سنا: "بہتر تھا

کہ وہ چپ ہی رہتا "

اچانک میرے باپ نے گھبراہٹ کا اظہار کیا۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا۔ بوڑھے مونگے کھودنے والے کے گرد کھڑے ہوئے اپنے افرادِ خاندان کی طرف گھور کر دیکھا اور تیزی سے ہمارے پاس آیا۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ اور تیور بدلے ہوئے تھے اس نے دھیمی آواز میں میری ماں سے کہا۔

" بڑی حیرت کی بات ہے کہ وہ مونگے بیچنے والا ٹیل معلوم ہوتا ہے "

میری ماں نے حیران ہو کر پوچھا " کون سا ٹیل ؟ "

میرے باپ نے جواب دیا " میرا بھائی ٹیل۔ اگر مجھے یہ علم نہ ہوتا کہ وہ امریکہ میں خوشحالی کی زندگی بسر کر رہا ہے تو میں اُسے ٹیل ہی سمجھتا "

ماں نے پریشان ہو کر کہا " جب تمہیں معلوم ہے کہ وہ شخص ٹیل نہیں تو تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو ؟ کہیں دماغ تو نہیں چل گیا ؟ میرے باپ نے میری ماں سے اصرار کرتے ہوئے کہا : کلاریس ! وہاں جاؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اُسے خود دیکھو "

وہ اٹھ کر اپنی لڑکیوں کے پاس گئی۔ میں خود اس شخص کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بوڑھا اور غلیظ تھا اور اس کے چہرے پہ جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھا اور نظریں اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔

میری ماں واپس آئی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ اُس نے تیزی سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ وہی ہے۔ تم کپتان سے کیوں نہیں پوچھ لیتے؟۔ مگر اس بات کی احتیاط کر لینا کہ یہ بدمعاش پھر ہمارے پلے نہ پڑ جائے۔"

میرا باپ چل پڑا میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ میرا دل بھر آیا دراز قد دبلا پتلا اور بھوری مونچھوں والا کپتان پل پہ چہل قدمی کر رہا تھا وہ اپنے آپ کو بڑی اہمیت دے رہا تھا گویا کہ وہ برطانیہ عظمیٰ کے ڈاک بردار جہاز کا افسر اعلیٰ تھا۔ میرا باپ نے بڑے تکلف سے اسے مخاطب کیا اور اس کے پیشے کے متعلق پوچھتے ہوئے سوال کیا "جرسی کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ یہاں کیا پیدا ہوتا ہے؟ یہاں کی آبادی کن لوگوں پر مشتمل ہے؟ یہاں کے رواج کیا ہیں؟ یہاں کی زمین کیسی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ آپ کے ہاں ایک بوڑھا مونگے بیچنے والا بھی ہے جو بڑا دلچسپ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ کیا آپ اس کے متعلق کچھ جانتے ہیں؟"

کپتان جو اس تمام گفتگو سے بیزار ہو گیا تھا خشک لہجہ میں بولا:

"یہ کوئی بوڑھا فرانسیسی لفنگا ہے جو پچھلے سال مجھے امریکہ میں ملا تھا اور جسے میں وہاں سے واپس لایا ہوں۔ آور نامی شہر میں اس کے کچھ رشتہ دار ہیں جن سے وہ ملنا نہیں چاہتا کیونکہ وہ ان کا مقروض ہے۔ اس کا نام ژیل ہے ـــــ ژیل دارمانش یا دارونش یا کچھ اس سے ملتا جلتا نام۔ معلوم ہوتا ہے کبھی اس کے پاس دولت تھی مگر اب جو کچھ اس کی حالت ہے وہ تم خود دیکھ ہی رہے ہو۔"

میرے باپ کا رنگ فق ہو گیا، اس کے گلے کی رگیں کھنچ گئیں اور آنکھوں سے بدحواسی ٹپکنے لگی اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا " بہت خوب! مجھے کچھ تعجب نہیں ہے، کپتان صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ،، یہ کہکر وہ چل پڑا اور حیرت زدہ کپتان اُسے دیکھتا رہ گیا۔ جب وہ میری ماں کے پاس واپس آیا تو وہ اس قدر حواس باختہ تھا کہ ماں کو یہ کہنا پڑا " بیٹھ جاؤ، کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ دال میں کچھ کالا ہے "

اس نے بینچ پر گرتے ہوئے کہا " وہی ہے۔ وہی ہے "

پھر اُس نے پوچھا: " اب تم کیا کرو گی؟ "

ماں نے جلدی سے کہا " ہمیں بچوں کو وہاں سے ہٹانا چاہیئے۔ چونکہ جوزف سب کچھ جانتا ہے۔ اس لئے یہ انہیں بُلا لائے گا۔ ہمارے داماد کو اس بات کا پتہ نہیں چلنا چاہیئے " والد کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا:

" کیا بد بختی ہے! "

میری ماں غضبناک ہو کر بولی: " میں تو ہمیشہ یہی سمجھتی تھی کہ یہ چور کوئی کام نہیں کریگا۔ اور دوبارہ ہم پر مصیبت بن کر ٹپک پڑے گا۔ داورانش خاندان کے افراد سے کچھ بھی بعید نہیں۔ "

میرے باپ نے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا جیساکہ وہ ہمیشہ بیوی سے جھڑک

کھا کر رکھا کرتا تھا۔ وہ پھر بولی:

"جوزف کو پیسے دو تاکہ مونگوں کی قیمت ادا کر دے اس بھکاری نے ہمیں پہچان لیا تو ہماری بد بختی کی انتہا ہو جائے گی۔ آؤ ہم دوسری طرف چلیں اور احتیاط رکھنا کہیں وہ شخص ہمارے قریب نہ آجائے۔"

وہ مجھے پانچ فرانک دے کر چلے گئے۔ میری بہنیں تصویر حیرت بنی میرے باپ کا انتظار کر رہی تھیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ماں کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی پھر میں نے مونگے بیچنے والے سے دام پوچھے۔ مجھے ہنسی آرہی تھی وہ میرا چچا تھا اس نے ڈھائی فرانک قیمت بتائی۔ میں نے اُسے پانچ فرانک کا نوٹ دیا اور اس نے باقی پیسے مجھے واپس کئے۔ میں نے اس کے ہاتھ کو دیکھا جو کہ غریب ملاح کا ہاتھ تھا اور جس پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی یہ ایک مصیبت زدہ بوڑھے کا چہرہ تھا میں نے دل میں کہا "یہ میرا چچا ہے میرے باپ کا بھائی ہے۔ میرا چچا ہے۔" میں نے اُسے نصف فرانک زائد دے دیا۔ اس پر اس نے میرا شکریہ ادا کیا "خدا تمہیں سلامت رکھے۔ چھوٹے سرکار" وہ اس نادار کی طرح بولا جو خیرات وصول کر رہا ہو۔ میں نے سوچا کہ وہ ضرور بھیک مانگتا رہا ہوگا۔ میری بہنوں نے میری سخاوت پر حیران ہو کر مجھے دیکھا۔ جب میں نے دو فرانک واپس کئے تو ماں نے حیرت سے پوچھا: "کیا ان کی قیمت تین فرانک تھی؟ یہ ناممکن ہے۔"

میں نے مضبوط آواز میں کہا "میں نے نصف فرانک انعام کے طور پر دے دیا"
ماں چونکی اور مجھے گھورتے ہوئے کہنے لگی :

"تم پاگل ہو گئے ہو۔ نصف فرانک یعنی دس سو تم نے اس آدمی کو دے دیئے۔ اس بدمعاش کو! ——"

جب میرے باپ نے اسکی طرف رازدارانہ انداز میں دیکھا تو وہ رک گئی کیونکہ وہ اپنے داماد کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اور سب خاموش ہو گئے۔

ہمارے سامنے افق کے کنارے سے ایک ارغوانی سایہ اٹھتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یہ جرسی تھا۔

جب ہم جہاز سے اتر رہے تھے تو میرے دل میں چچا ژول سے دوبارہ ملنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے قریب جا کر پیار بھرے الفاظ سے اسکی ڈھارس بندھاؤں۔ مگر چونکہ مونگوں کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ اس لئے وہ نیچے اپنے سوراخ میں چلا گیا تھا۔ یہی غلیظ سوراخ اس کا گھر تھا۔

آوارہ

رینڈل کو کام کی تلاش میں جگہ جگہ پھرتے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ اُس نے اپنے آبائی قصبے کو خیرباد کہہ دیا تھا کیونکہ وہاں اس کے لئے کوئی کام نہ تھا۔ وہ بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ اس کی عمر ۲۷ ستائیس سال تھی وہ مستقل مزاج آدمی اور اچھا کاریگر تھا۔ مگر وہ سب سے بڑا لڑکا ہونے کے باوجود اپنے گھر والوں کا محتاج ہونے پہ مجبور تھا۔ چونکہ کام کاج کی سرد بازاری تھی۔ اس لئے وہ سوائے اِدھر اُدھر پھرنے کے اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ کھانے پینے کی قلت

دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی دو بہنیں خادمائیں تھیں۔ مگر انہیں بہت کم معاوضہ ملتا تھا۔ اور وہ سب سے زیادہ مضبوط تھا مگر دوسروں کا دست نگر تھا۔ کیونکہ وہ بے کار تھا۔ وہ ٹاؤن ہال گیا تو میئر کے سیکرٹری نے اسے بتایا کہ اسے دستکاری کے مرکز میں کام مل سکتا ہے۔ اس کے کہنے پر وہ اپنے ضروری کاغذات لے کر چل پڑا۔ اس نے جوتوں کے ایک فالتو جوڑے، ایک پاجامے اور ایک قمیض کو ایک نیلے رومال میں باندھ کر اپنی چھڑی کے ساتھ لٹکا لیا۔

وہ دن رات، خواہ دھوپ ہو یا بارش نہ ختم ہونے والی سڑکوں پر مسلسل چلتا رہا۔ مگر وہ اس پراسرار ملک میں نہ پہنچ سکا جہاں مزدوروں کو کام ملتا ہے۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ وہ اپنا بڑھئی کا کام ہی کرے گا۔ مگر جب اسے ہر دکان پر یہی جواب ملا کہ کام مندا ہونے کی وجہ سے کاریگروں کو جواب دینا پڑا ہے تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ جو کام بھی مل جائے کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے کئی طرح کے کام کئے۔ کبھی تو اس نے کھدائی کا کام کیا اور کبھی پتھر کوٹنے کا۔ کبھی وہ اصطبل میں کام کرتا تھا۔ اس نے لکڑیاں کاٹنے، درختوں کی ٹہنیاں توڑنے اور کوئیں کھودنے کا کام بھی کیا۔ اس نے پہاڑوں پر بکریوں کی رکھوالی بھی کی۔ یہ تمام کام اس نے چند پیسوں کے معاوضے پر کئے۔ اُسے زیادہ سے زیادہ ایک وقت میں دو تین روز کا کام ملتا تھا اور وہ بھی اس لئے کہ وہ کسانوں اور دیگر کام دینے والوں کے لالچ کو ترغیب دینے

کے لئے نہایت ہی شرمناک حد تک قلیل معاوضہ پر اپنی خدمات پیش کر دیتا تھا۔ اس کے باوجود ایک ہفتہ سے اُسے کوئی کام نہ ملا تھا اور اُس کے پاس کوئی پیسہ نہ تھا۔ وہ ایک عورت سے مانگی ہوئی روٹی کھاتا رہا تھا۔ شام کا دھندلکا ہو رہا تھا۔ رینڈل خالی پیٹ۔ ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ ننگے پاؤں سڑک کے کنارے گھاس پر چل رہا تھا۔ اس نے جُوتوں کا جوڑا ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ یہ بھی پہلے جوڑے کی طرح ٹوٹ پھوٹ نہ جائے۔ موسمِ خزاں کے آخری ایام تھے اور ہفتہ کا دن تھا۔ پانی سے بھرے ہوئے مست بادلوں کو ہوا درختوں کے درمیان اڑائے پھر رہی تھی اور بارش کے آثار نمایاں تھے گاؤں میں کوئی شکل نظر نہیں آتی تھی۔ کھیتوں میں سے سوائے چھٹکے ہوئے اناج کے تنکوں کے کچھ نہ تھا۔ کھیت بالکل عریاں تھے اگلی فصل کیلئے بیج ڈالا جاچکا تھا۔

رینڈل کو سخت بھوک لگ رہی تھی۔ جانوروں کی طرح کی شدید بھوک ...... وہ بھوک جو بھیڑیوں کو انسانوں پر حملہ کرنے پر آمادہ کرتی ہے...... اس نے لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کئے تاکہ اُسے کم قدم اٹھانے پڑیں۔ اس کا سر بھاری تھا۔ کنپٹیوں میں خون تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ آنکھیں سُرخ تھیں اور منہ خشک۔ اس نے مضبوطی سے اپنا ڈنڈا تھام لیا اور اُس کے جی میں آیا کہ اُسے اس راہگیر کے سر پہ دے مارے

جو شام کا کھانا کھانے اپنے گھر واپس جا رہا ہو۔ اس نے سڑک کے کنارے پر اِدھر اُدھر اس خیال سے دیکھا کہ شاید کوئی آلو نظر آجائے تاکہ وہ کسی گڑھے میں آگ جلا کر اسے بھون لے اور کھانے سے پہلے گرم آلو کو اپنے سرد ہاتھوں میں لے کر انہیں گرم کرے۔ مگر آلو کا موسم گذر چکا تھا۔ اس لئے اُسے ایک سوکھا ہوا چقندر ہی چبانا پڑا۔ ایک دن پہلے بھی اُسے یہی کرنا پڑا تھا۔

دو دن سے تیز چلتے وقت وہ خود سے اونچی آواز میں باتیں کرنے لگا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی سوچ بچار نہیں کیا تھا اس نے اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں اپنی صنعتکاری کے لئے مخصوص کر رکھی تھیں مگر اب معاملہ دگرگوں تھا۔ وہ تھکن اور تلاشِ روزگار سے بڑ دل آزما تھا۔ اُسے ہر جگہ انکار اور دھتکار کا سامنا تھا۔ وہ رات کو گھاس پر بھوکا سوتا تھا۔ گھر والے اس بے خانماں سے نفرت کرتے تھے اور ہر شخص یہی پوچھتا تھا کہ "تم اپنے گھر ہی میں کیوں نہ رہے؟" اسے اس بات کا بھی دکھ تھا کہ وہ اپنا مضبوط بازو کام کاج کے لئے استعمال نہیں کر سکتا اُسے اپنے نادار بہن بھائیوں کی یاد بھی آتی تھی جن کے پاس پیسہ کبھی نہ تھا۔ یہ تمام خیالات ہر لمحہ اس کے دل میں غم و غصہ پیدا کرتے تھے اور اس کی وضعداری کے باوجود یہ غصہ چھوٹے چھوٹے شکایت آمیز جملوں کی صورت میں اس کے ہونٹوں سے ٹپکنے لگتا تھا۔

اس کے برہنہ پاؤں تلے سنگریزے لڑھک رہے تھے۔ جب اس کے پاؤں ایک پتھر سے ٹکرا کر ڈگمگائے تو وہ فریاد کرنے لگا۔

"کیا مصیبت ہے! کس قدر بدبختی ہے! سؤر کہیں کے..... وہ ایک انسان کو..... ایک بڑھئی کو بھوکا مرنے کے لئے چھوڑ دیں گے..... سؤر کہیں کے..... دو پیسے بھی نہیں دیتے..... دو پیسے بھی نہیں۔ اب تو بارش بھی ہو رہی ہے —— سؤر کہیں کے۔"

اُسے تقدیر کی بے انصافی پر طیش آ رہا تھا اور وہ انسانوں کو موردِ الزام ٹھہراتا تھا، تمام انسانوں کو، کیونکہ فطرت کی کورچشم مادرِ عظیم ظالم اور بے انصاف ہے۔ شام کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا وہ مکان کی چھتوں میں سے دھواں اٹھتا دیکھ کر اپنے دانت پیستے ہوئے یہی الفاظ بار بار دہرا رہا تھا —— "سؤر کہیں کے" مگر وہ انسانی بے انصافی کی ایک اور قسم کے متعلق نہیں سوچتا تھا۔ وہ قسم جسے ڈاکہ زنی اور تشدد کہتے ہیں۔ یا آخر اس کے جی میں آیا کہ وہ ان مکانوں میں سے کسی ایک میں گھس جائے اور تمام مکینوں کو قتل کر کے خود کھانے کی میز کے سامنے بیٹھ کر دادِ عیش دے۔ اس نے خود سے کہا "مجھے زندہ رہنے کا حق ہے۔ اور وہ مجھے بھوکا مار رہے ہیں۔ اور میں تو صرف کام کرنا چاہتا ہوں ——

تشؤر کہیں کے" اس کے اعضا کی تھکن اور اس کے دل کی جلن نشہ کی شدید لہر کی طرح اس کے ذہن میں ابھری اور یہ سادہ سا خیال پیدا کیا۔ "مجھے زندہ رہنے کا حق ہے کیونکہ میں سانس لیتا ہوں اور ہوا سب کی مشترکہ املاک ہے اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مجھے روٹی سے محروم کرے۔"

موسلا دھار اور خنک بارش برسنے لگی۔ وہ ٹھہر گیا اور بڑبڑانے لگا "کیا مصیبت ہے! گھر پہنچنے کے لئے ایک مہینہ اور پیدل چلنا پڑے گا۔" وہ گھر واپس آرہا تھا۔ کیونکہ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ شاہراہوں کی نسبت اُسے اپنے آبائی قصبہ میں کام زیادہ آسانی سے مل سکے گا۔ شاہراہوں پہ تو لوگ اُسے شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور اب تو اُسے جو کام بھی مل جائے وہ اس کے لئے اپنے آپ کو تیار کر چکا تھا۔ کیونکہ بڑھئی کے کام کی مانگ نہ تھی اس لئے اس نے سوچا کہ وہ مزدور۔ معمار کا ماتحت مزدور، خندق کھودنے والا یا پتھر کوٹنے والا ہی بن جائے گا اگر اُسے دو روپے ہی روزانہ مل جائیں تو اس کے کھانے کا سامان تو ہو جائے گا۔

اس نے اپنا رومال اپنی گردن میں باندھ لیا تاکہ بارش کے ٹھنڈے پانی سے اپنے سینے اور پشت کو بچا سکے۔ مگر جلد ہی پانی رومال سے گذر کر جسم تک پہنچ گیا۔ اور اس نے گھبراہٹ اور تکلیف کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُسے سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ نہیں نظر آ رہی تھی۔ رات نے

پورے گاؤں کو تاریکی کی لپیٹ میں لے لیا۔ اُسے دور مرغزار کی گھاس پر ایک دھبہ سا دکھائی دیا۔ یہ گائے تھی۔ چنانچہ بغیر سوچے سمجھے وہ اسکی طرف بڑھا۔ گائے نے اُسے اپنے قریب پاکر اپنا سر اٹھایا۔ رینڈل نے سوچا "اگر میرے پاس پیالہ ہوتا تو میں دودھ حاصل کر سکتا تھا،" گائے نے اسکی طرف دیکھا اور اس نے گائے کی طرف دیکھا۔ یکایک اس نے گائے کو زور سے ٹھوکر لگا کر کہا "اُٹھو!" گائے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے بوجھل تھن نیچے لٹک رہے تھے۔ وہ اسکی ٹانگوں کے درمیان بیٹھ کے بل زمین پر لیٹ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کے گرم اور موٹے موٹے تھنوں کو دبا کر دودھ پیتا گیا۔ یہاں تک اس جاندار کنوئیں میں کوئی دودھ باقی نہ رہا۔ مگر بارش اور تیز ہو گئی اور اُسے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ مل رہی تھی۔ اُسے سردی لگ رہی تھی۔ اس نے درختوں کے درمیان ایک کھڑکی میں سے نکلتی ہوئی روشنی کو دیکھا۔

گائے بیٹھ گئی۔ وہ بھی اس کے قریب بیٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ غذا کے لئے اس کا احسان مند تھا گائے کے نتھنوں سے ندی کے دودھلے کی طرح نکلنے والی گرم سانس اس کا ریگر کے چہرے سے مس کر رہی تھی۔ اس نے کہا "مکان والو! تمہیں سردی نہیں لگتی۔" اس نے ایک ہاتھ گائے کے سینے میں ڈالا اور دوسرا اسکی ٹانگوں

میں تاکہ اپنے آپ کو گرم کر سکے - پھر اسے خیال آیا کہ وہ گائے کے گرم اور کشادہ پیٹ کے نیچے ہی کیوں نہ رات بسر کرے - چنانچہ اس نے مناسب جگہ تلاش کر لی - وہ اپنا سر اس کے تھنوں کے ساتھ پیوست کر کے لیٹ گیا - ان تھنوں کے ساتھ جنہوں نے اسکی بھوک پیاس کو ختم کیا تھا چونکہ وہ تھکا ہوا تھا اس لئے بہت جلد سو گیا -

بار بار اس کی آنکھ کھل جاتی کیونکہ اس کے جسم کا وہ حصہ جو گائے کے جسم سے دوری کی وجہ سے حرارت نہ لے سکتا تھا - نیم منجمد ہو جاتا تھا - اس لئے اسے کئی بار پہلو بدلنا پڑتا تھا - مرغ کی اذان نے اُسے جگا دیا پو پھوٹ رہی تھی ، بارش تھم چکی تھی اور مطلع صاف تھا - گائے اپنی تھوتھنی زمین پر رکھے آرام کر رہی تھی - اس نے جھک کر اسکے نتھنوں کو چومتے ہوئے کہا " الوداع ! اے میری پیاری حسینہ - پھر ملیں گے - تم بہت عمدہ جانور ہو - الوداع - " یہ کہکر اس نے جوتے پہنے اور سڑک پر چلنے لگا - دو گھنٹے مسلسل چلنے کے بعد وہ تھک کر گھاس پر بیٹھ گیا - اب دن چڑھ آیا تھا - گرجے کے گھنٹے بج رہے تھے - نیلی قمیضوں میں ملبوس مرد اور سفید ٹوپیاں پہنے ہوئیں عورتیں سڑک پر سے گذرنے لگیں کچھ لوگ پیدل تھے اور کچھ گاڑیوں میں - وہ قریبی دیہاتوں میں اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ اتوار گذارنے جا رہے تھے -

ایک کسان بھیڑیں ہانکتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کا کتا اس کی بھیڑوں کو یکجا رکھنے میں اسکی مدد کر رہا تھا۔ رینڈل اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی ٹوپی ہوا میں بلند کر کے اس سے کہنے لگا "کیا آپ ایک فاقہ کش کو کسی کام پہ لگا سکتے ہیں۔ وہ فاقہ کش جو بھوک سے مر رہا ہے" مگر اس کسان نے اس آوارہ شخص کو غصے سے دیکھ کر جواب دیا: "سڑک پر بیٹھنے والے آوارہ لوگوں کے لئے میرے پاس کوئی کام نہیں" بیچارہ بڑھو دوبارہ خندق کے کنارے بیٹھ گیا۔ وہ بہت دیر تک انتظار کرتا رہا۔ وہ سڑک پر گزرنے والوں کو دیکھتا رہا۔ وہ ایسے شخص کا منتظر تھا۔ جو چہرے سے رحم دل نظر آئے تاکہ وہ اس سے بھی وہی درخواست کرے جو اس نے کسان سے کی تھی۔ آخر کار اس نے ایک آدمی کو منتخب کر ہی لیا۔ یہ شخص کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اور ایک سنہری زنجیر اسکی توند کی آرائش کر رہی تھی۔ "میں کام کی تلاش میں ہوں۔ مجھے دو مہینوں سے کوئی کام نہیں ملا اور میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں" اس نے کہا۔ اس کے جواب میں وہ شخص بولا "کیا تم نے دیہات کے شروع میں یہ نوٹس نہیں پڑھا کہ یہاں بھیک مانگنا ممنوع ہے۔ میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ میں یہاں کا میئر ہوں اور اگر تم جلدی سے اس گاؤں کو چھوڑ نہ دو گے تو میں تمہیں گرفتار کرا دوں گا" رینڈل نے غصہ سے جواب دیا۔

"بڑے شوق سے مجھے گرفتار کروا دو میں بھوکے مرنے پر گرفتار ہونے کو ترجیح دیتا ہوں" یہ کہکر وہ واپس جا کر خندق کے کنارے بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد دو سپاہی سڑک پر نمودار ہوئے۔ وہ چمکتے ہوئے ہیٹ پہنے زرد کپڑوں میں ملبوس ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ گویا وہ بدکاروں کو ڈرا کر بھگانے کی غرض سے نکلے تھے۔ اُسے خبر تھی کہ وہ اُسی کی طرف آرہے ہیں۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ کیونکہ وہ ان کی حکم عدولی کر کے گرفتار ہونا چاہتا تھا۔ ان کے انداز سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ اُسے دیکھ نہیں رہے۔ وہ پریڈ کرتے ہوئے آرہے تھے۔ جب وہ اس کے قریب سے گذرے تو اُسے دیکھ کر ٹھہر گئے حوالدار نے آگے بڑھ کر پوچھا "تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟"

"میں آرام کر رہا ہوں" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟" حوالدار نے پوچھا

"اگر میں ان تمام جگہوں کا جہاں میں رہ چکا ہوں تم سے ذکر کردوں تو مجھے ایک گھنٹے سے زیادہ عرصہ لگے گا۔"

"تم کہاں جارہے ہو؟"

"وِل اوادی کی طرف"

"وہ کہاں واقع ہے؟"

"لاہانش میں"

"کیا تم وہاں کے رہنے والے ہو؟"

"جی ہاں"

"تم وہاں سے کیوں نکلے تھے؟"

"تلاشِ معاش کے لئے"

حوالدار بوکھلا گیا اور غصہ بھرے لہجے میں بولا "سب یہی کچھ کہتے ہیں۔ یہ لفنگے کہیں کے۔ مجھے سب خبر ہے۔ کیا تمہارے پاس کوئی کاغذات ہیں؟"

"ہاں میرے پاس کچھ کاغذات ہیں"

"مجھے دکھاؤ"

رینڈل نے اپنی اسناد جیب سے نکالیں جو گندی اور شکستہ تھیں۔ سپاہی نے انہیں لے کر پڑھا اور درست پاکر واپس کر دیا اسی آدمی کی طرح جو اپنے سے زیادہ چالاک سے دھوکا کھا گیا ہو تھوڑی دیر سوچ کر سپاہی نے پوچھا "کیا تمہارے پاس کوئی نقدی ہے؟"

"نہیں" رینڈل نے جواب دیا

"بالکل نہیں؟"

"نہیں"

"ایک آنہ بھی نہیں؟"

"ایک آنہ تک نہیں"

"کس طرح گذر اوقات کرتے ہو؟"

"لوگوں کی بخشش پہ"

"اس کا مطلب ہے کہ تم بھیک مانگتے ہو؟"

"ریڈنل نے خوداعتمادی سے جواب دیا "ہاں۔ جب بھی ممکن ہوتا ہے"

سپاہی نے کہا "میں نے تمہیں شاہراہ پر بھیک مانگتے ہوئے اور آوارہ گردی کرتے ہوئے پکڑا ہے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیتا ہوں"

بڈھی چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا "جہاں آپ کی مرضی چلیئے" اور پیشتر اس کے کہ وہ اسے حکم دیں وہ ان دونوں کے درمیان کھڑا ہو کر کہنے لگا "مجھے شوق سے قید کر دیجئے۔ وہاں مجھے بارش سے بچانے کے لئے چھت تو ہو گی"

وہ گاؤں کی طرف چل پڑے۔ بے برگ درختوں کے درمیان سے مکانوں کی سرخ اینٹیں نظر آ رہی تھیں۔ جب وہ وہاں پہنچے تو گرجے میں عبادت

شروع ہونے والی تھی - چوراہا آدمیوں سے بھرا ہوا تھا - لوگوں نے مجرم کو دیکھنے کے لئے دو قطاریں بنالیں ۔ بچے اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے ۔ مرد و زن قیدی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے اور اس پر پتھر برسانا چاہتے تھے، ان کا بس چلتا تو ناخنوں سے اس کا گوشت نوچ لیتے اور اُسے پاؤں تلے روند ڈالتے اُن کا خیال تھا کہ اُس نے کوئی قتل کیا ہے یا کہیں ڈاکہ ڈالا ہے - مگر ایک قصاب نے جو کبھی سپاہی رہ چکا تھا بتلایا کہ وہ ایک آوارہ شخص ہے تمباکو فروشں کا خیال تھا - کہ یہ وہی شخص ہے جو صبح اُسے ایک کھوٹا فرانک دے گیا تھا - لوہار کہہ رہا تھا کہ وہ مالے نامی بیوہ کا قاتل ہے - جسے پچھلے چھ مہینوں سے پولیس تلاش کر رہی تھی -

اُسے میونسپل کونسل کے ہال میں لے جایا گیا جہاں اُس نے میئر کو کرسی عدالت پر جلوہ گر دیکھا اور اس کے پہلو میں سکول ماسٹر بیٹھا ہوا تھا - میئر نے جو مجسٹریٹ کے فرائض انجام دے رہا تھا کہا:

"اوہو! تم پھر یہیں آگئے - میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ میں تمہیں قید کروا دوں گا - کہو حوالدار جی! اس پر کیا الزام ہے؟"

حوالدار نے جواب دیا :- "جناب میئر صاحب یہ ایک آوارہ اور بدمعاش آدمی ہے جس کا کوئی گھر بار نہیں ہے - نہ اس کے پاس پیسہ اور نہ کوئی آمدنی

کا ذریعہ ہے۔ میں نے اسے بھیک مانگتے ہوئے پکڑا ہے۔ مگر اس کے پاس اچھی اسناد ہیں اور اس کے تمام کاغذات درست اور باضابطہ ہیں۔"

"مجھے اس کے کاغذات دکھاؤ؟" میئر نے حوالدار سے کہا

اس نے کاغذات لے کر انہیں بار بار پڑھا اور پھر انہیں واپس کرتے ہوئے حکم دیا "اس کی تلاشی لی جائے"

پولیس نے اس کی تلاشی لی مگر کچھ نہ دستیاب ہوا۔ میئر نے پریشان ہو کر رینڈل سے پوچھا۔ "آج صبح تم سڑک پر کیا کر رہے تھے؟"

"میں کام تلاش کر رہا تھا"

"کام؟ اور شاہراہوں پر؟"

"تو کیا آپ کا خیال ہے کہ میں جنگل میں چھپ جاؤں تو پھر کام ملے گا۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو دو مختلف النوع درندوں کی طرح نفرت سے گھورا۔ مجسٹریٹ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

"میں تمہیں رہا کرتا ہوں۔ مگر دوبارہ اس حالت میں میرے سامنے نہ آنا۔"

بڑھیا نے جواباً کہا "میری تو یہ تمنا تھی کہ آپ مجھے جیل خانے بھجوا دیتے میں کافی اِدھر اُدھر مارا مارا پھر چکا ہوں"

مجسٹریٹ نے سختی سے اُسے خاموش رہنے کا حکم دیا اور دو سپاہیوں سے کہا کہ اُسے گاؤں سے دو سو گز کے فاصلے پر چھوڑ آئیں۔ تاکہ وہ اپنا سفر جاری رکھے۔

"مجھے کچھ کھانے کے لئے تو دیجئے" کاریگر نے کہا

مگر مجسٹریٹ نے ناراض ہو کر کہا "ہم تمہاری خوراک کے ذمہ دار نہیں۔ یہ ناممکن بات ہے" اس پر رینڈل بولا "اگر تم نے مجھے بھوکا مرنے کیلئے چھوڑ دیا تو تم مجھے ارتکابِ جرم پر مجبور کرو گے۔ اور یہ خود تمہارے ہی حق میں برا ہو گا"۔

میئر نے اٹھتے ہوئے کہا "اسے فوراً لے جاؤ ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔"

دونوں سپاہی بڑھئی کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے اس نے کوئی مدافعت نہ کی۔ گاؤں میں سے گذرتا ہوا وہ دوبارہ شاہراہ پر آ گیا۔ جب وہ گاؤں سے دو سو گز کے فاصلے پر آ گئے تو حوالدار نے کہا:

"اب یہاں سے دور ہو جاؤ اور مجھے دوبارہ پکڑنے کی زحمت نہ دو ورنہ تمہاری خیر نہیں"

رینڈل بغیر جواب دیئے چل پڑا۔ اُسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ پندرہ بیس منٹ تک بدحواسی کے عالم میں بے سوچے

سمجھے چلتا رہا۔ اچانک ایک کھڑکی میں سے شوربے اور اُبلے ہوئے گوشت کی بُو آئی۔ وہ ٹھہر گیا۔ اُسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ وہ بھوک سے دیوانہ ہو کر ایک وحشی درندے کی طرح گھر کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس نے بآواز بلند کہا "انہیں چاہیے کہ اس دفعہ مجھے خدا کے نام پر ضرور کچھ نہ کچھ دیں۔"

اس نے اپنی چھڑی سے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ مگر کوئی باہر نہ آیا۔

اس نے اور زور سے دستک دی اور چلا کر کہا "اے گھر والو! ذرا دروازہ تو کھولو" مگر کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے زور لگا کر کھڑکی کھولی۔ شوربے، گوشت اور گوبھی کی بو سے بسی ہوئی باورچی خانے کی گرم ہوا کھڑکی سے باہر نکلی اور بڑھئی چھلانگ لگا کر گھر میں داخل ہو گیا۔ میز پر دو دستر خوان بچھے تھے، گھر والے گرجا گھر میں گئے تھے۔ گوشت اور شوربہ آگ پر گرم کرنے کے لئے رکھا ہوا تھا۔ دو بوتلوں کے درمیان روٹی رکھی ہوئی تھی۔ یہ دو بوتلیں شراب سے پر تھیں۔

ریمنڈل نے سب سے پہلے روٹی پر ہاتھ ڈالا اور اُسے اس سختی سے توڑا جیسے وہ کسی کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ پھر وہ بے تحاشا کھانے لگا اور بڑے بڑے لقمے بغیر چبائے نگل گیا۔ فوراً ہی گوشت کی خوشبو آئی تو وہ چولھے کی طرف لپکا اور دیگچی کا ڈھکنا اٹھا کر گائے کے گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا نکال لایا۔ پھر اس نے گوبھی، گاجروں اور پیازوں سے اپنی تھالی

بھری اور میز کے سامنے اس طرح بیٹھ کر کھانا شروع کیا گویا وہ اپنے ہی - وہ
میں بیٹھا ہوا تھا۔

ا - اس نے

جب وہ تمام گوشت اور بہت سی سبزی کھا چکا تو اُسے ہی کتوں کی
لگی اور اس نے انگیٹھی پہ پڑی ہوئی بوتلوں میں سے ایک بوتل اٹھالی اس سے پوچھا
گلاس میں انڈیلی تو اُسے پتہ چلا کہ یہ شراب برانڈی ہے - یہ پہ کود پڑا اگرچہ
بڑی اچھی بات تھی - برانڈی حرارت بخشی ہے - وہ اس آتش سے پایا تو کہنے
سرد رگوں میں گرمی پہنچائے گا - چنانچہ اس نے برانڈی پی اور اسے د
دو گلاس بھر کے پی لئے وہ شراب کا عادی نہ تھا - جلد ہی اس پہ نہ ہو رہا
طاری ہو گیا اور اس عالم مستی میں اس پر خوشی کی کیفیت چھا گئی - نا جو

وہ پھر کھانے کے لئے بیٹھ گیا - مگر اب اس کے کھانے کی رفتہ بے
نرم پڑ گئی وہ اپنی روٹی شوربے میں ڈبو کر آہستہ آہستہ کھاتا تھا - اُسے جسم اور
خصوصًا اس کے ماتھے پر جلن محسوس ہوئی اور اس کے ماتھے کی رگیں پھڑکنے لگیں
یکایک گرجا گھر کی گھنٹیاں بجنے لگیں - عبادت ختم ہو چکی تھی - احتیاط کے جذبے
نے جو خطرہ میں انسانوں کی راہبری کرتا ہے بڑھئی کو اٹھ کھڑا ہونے پر آمادہ
کیا - اُس نے باقی ماندہ روٹی کو ایک جیب میں ڈالا اور دوسری جیب میں
شراب کی بوتل ڈالی اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر سڑک پہ نظر ڈالی - وہاں کوئی
نہیں تھا - وہ چھلانگ لگا کر وہاں سے چلتا بنا - مگر شاہراہ پہ چلنے کی بجائے

سمجھے چلتیا کھیتوں میں سے گذرتا ہوا جنگل کی طرف ہو لیا۔

آئی۔ وہ کھ اُسے اپنے اندر چستی، قوت اور بے فکری کا احساس ہوا۔

ایک وحشی س کارنامے پر بہت خوش تھا۔ اس کے جسم میں ایسی لچک پیدا

"انہیں چاہیے چھلانگ لگا کر کھیتوں کے گرد لگی ہوئی باڑ کو پھاند جاتا

اس نے اپنی جو وہ درخت کے نیچے پہنچ گیا تو جیب سے بوتل نکال کر پینے

اس نے او تا چلتا جاتا تھا اور پیتا جاتا تھا۔ اب نشہ سے اس کے خیالات گڈمڈ

دروازہ تو لگے۔ اس کی آنکھیں خمار آلود ہو گئیں اور اس کی ٹانگیں سپرنگ کی

شہر سے لچکدار ہو گئیں۔ اور اس نے یہ لوک گیت گانا شروع کیا۔

کھڑکی۔

کیسا اچھا ہے، کتنا پیارا ہے

دو۔

رس بھری کو اٹھا کے کھا جانا

وہ خنک اور مرطوب گھاس پہ چل رہا تھا، اس کے پاؤں تلے بچھے ہوئے نرم و گداز قالین نے اس کے دل میں سر کے بل چلنے کی امنگ پیدا کی۔ اس نے بار بار قلا بازیاں لگانی شروع کیں۔ اور ایک بار پھر وہی گیت گانے لگا:

کتنا اچھا ہے، کیسا پیارا ہے

جا کے جنگل میں رس بھری کھانا

وہ قلا بازیاں لگاتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ اچانک اُس نے اپنے آپ کو

نشیبی سڑک کے کنارے پایا۔ سڑک پر ایک دراز قامت لڑکی کھڑی تھی۔ وہ ایک خادمہ تھی جو گاؤں کی طرف معدودے کی دو بالٹیاں لئے جا رہی تھی۔ اس نے لڑکی کو جھک کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ چمک پیدا ہوئی جو شکاری کتوں کی آنکھوں میں شکار کی بو سونگھ کر پیدا ہوتی ہے۔ لڑکی نے اس سے پوچھا "کیا تم یہ گانا گا رہے تھے؟" وہ بغیر جواب دیئے سڑک پر کود پڑا اگرچہ سڑک کا نشیب چھ فٹ تھا۔ جب لڑکی نے اُسے اپنے قریب پایا تو کہنے لگی "ہائے۔ ہائے! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا"

مگر وہ اس کی آواز نہ سن سکا۔ وہ بدمست تھا، وہ دیوانہ ہو رہا تھا فطرت کے اس تقاضے نے اس کے اندر ہیجان برپا کر رکھا تھا جو بھوک سے زیادہ شدید اور شراب سے تند تر ہے۔ اسکی رگ و پے میں اس آدمی کا ولولہ اور جوش و خروش تھا جو دو مہینوں سے ہر چیز کا محتاج ہے۔ اور جسے شراب کا نشہ بے قابو کر دے۔ جو جوان اور مضبوط ہو اور جس کے اندر اُن خواہشات نے آگ لگا رکھی ہو جو فطرت ہر قوی انسان کو ودیعت کرتی ہے۔

لڑکی اس کا چہرہ، اسکی آنکھیں، اس کا نیم وا دہن اور کشادہ بازو دیکھ کر ڈر سے پیچھے ہٹی۔ مگر اس نے اسے شانوں سے پکڑ لیا اور بغیر ایک لفظ کہے اُسے سڑک پر گرا لیا۔

لڑکی نے اپنی بالٹیوں کو گرنے دیا۔ وہ شور پیدا کرتی ہوئی۔ سڑک پر لڑھکنے لگیں۔ اور تمام دودھ بہ گیا۔ لڑکی چیخنے لگی۔ مگر یہ سمجھتے ہوئے کہ اس ویران جگہ میں مدد کے لئے پکارنا فضول ہے، اور یہ جان کر وہ اُسے جان سے مارنا نہیں چاہتا رام ہو گئی۔ وہ زیادہ ناراض بھی نہ تھی کیونکہ رینڈل مضبوط، نوجوان اور خوبصورت تھا اور نہ ہی وہ ناشائستہ تھا۔

جب وہ اُٹھ کھڑی ہوئی تو گری ہوئی بالٹیوں کو دیکھ کر غصہ میں آگئی۔ اور اس نے اپنا لکڑی کا سینڈل اتارا اور اس کے سر پہ پھینکا کیونکہ اس نے اس کے دودھ کی قیمت ادا نہ کی تھی۔

مگر وہ اس شدید اور اچانک حملے کا مطلب غلط سمجھا اور اپنے عمل سے خوفزدہ ہو کر تیزی سے بھاگ نکلا وہ اس پر پتھر پھینکنے لگی۔ کچھ پتھر اسکی پیٹھ پر لگے وہ بہت دیر تک بھاگتا رہا یہاں تک کہ وہ تھک کر چور ہو گیا۔ وہ زندگی بھر اس قدر نہ تھکا تھا۔ اسکی ٹانگوں میں اس کے جسم کا بوجھ اٹھانے کی سکت باقی نہ رہی تھی، اس کے خیالات میں انتشار تھا، وہ سب کچھ بھول گیا وہ کسی چیز کے متعلق سوچ ہی نہ سکتا تھا۔ وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور چند لمحوں میں گہری نیند سو گیا۔ مگر بہت جلد اُسے شدید جھٹکوں کے ساتھ جگایا گیا۔ آنکھیں کھلنے پر اُسے دو چمکتے ہوئے خود نظر آئے۔ وہی دو سپاہی جو صبح اسے سڑک پر چھوڑ گئے تھے اس کی

مشکیں کس رہے تھے۔

"مجھے علم تھا کہ میں تمہیں دوبارہ گرفتار کروں گا" حوالدار نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ مگر رینڈل بغیر جواب دیئے اٹھ کھڑا ہوا۔ دو سپاہیوں نے اسے جھٹکا۔ اگر وہ کسی قسم کی حرکت کرتا تو وہ اس پر سختی کرنے کے لئے تیار تھے کیونکہ وہ اب ان کا صیدِ زبوں تھا، وہ جیل خانے کا باسی بن چکا تھا۔ جسے مجرموں کا شکار کرنے والے پکڑے ہوئے تھے جن سے وہ چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

حوالدار نے چلنے کا حکم دیا اور تینوں چل پڑے۔ شام کا وقت ہو رہا تھا۔ خزاں کا موسم تھا، شفق پر تاریکی کا غلبہ تھا، آدھ گھنٹے میں وہ گاؤں میں پہنچ گئے۔ ہر گھر کا دروازہ کھلا تھا، لوگوں کو تمام واردات کی خبر ہو چکی تھی۔ دیہات کے مرد، عورتیں اور لڑکیاں غصہ سے بے قابو ہو رہی تھیں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہر آدمی پر ڈاکہ ڈالا گیا ہے اور ہر عورت کی عصمت دری ہوئی ہے۔ وہ اس بدمعاش کو دیکھنے کے لئے منتظر تھے تاکہ اس پر لعنت اور ملامت کی بوچھاڑ کریں۔ وہ جس گھر کے پاس سے بھی گذرا اس پر صدائے تلعین بلند ہوئی یہاں تک کہ وہ اُس گھر میں پہنچا جہاں پر میئر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بھی اس بدمعاش سے جلد از جلد انتقام لینا چاہتا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی بول اٹھا: "اے ذاتِ شریف! اگو یا تم

آ گئے " وہ معمول سے زیادہ خوش تھا اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "میں نے پہلے ہی کہہ دیا، اس وقت جب میں اسے سڑک کے کنارے ملا تھا "

اور پھر اطمینان کے ساتھ کہا " او بدمعاش کہیں کے ، او ذلیل انسان تمہیں بیس سال قید کی سزا دی جائے گی "

مسئلۂ لاطینی

مسئلہ لاطینی جو کچھ عرصہ پیشتر ہمارے لئے دردسر تھا مجھے اپنی نوجوانی کے زمانے کے ایک واقعہ کی یاد دلاتا ہے

میں روبینوانسٹی ٹیوٹ میں جو ایک بڑے شہر میں واقع ہے۔ ایک استاد سے پڑھا کرتا تھا۔ یہاں لاطینی زبان پر خاص توجہ دی جاتی تھی اور اسی وجہ سے یہ مدرسہ تمام صوبہ میں مشہور تھا۔

پچھلے دس سالوں میں اس مدرسہ کا نتیجہ باقی تمام بڑے بڑے

مدرسوں سے اچھا رہا تھا اور یہ کامیابی ایک معمولی استاد کی بدولت تھی۔ جو شخص نائب مدرس تھا جس کا نام موسیو پکدران یا فادر پکدراں تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا تھا اور ان خوش باش لوگوں میں سے تھا جن کی عمر کا صحیح اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ بیس سال کی عمر میں وہ اس مدرسے میں اس خیال سے نائب معلم ہو گیا تھا۔ کہ وہ اس طرح سے ڈاکٹر آف لاء کی ڈگری حاصل کرنے کی تیاری شروع کر دے گا۔ مگر وہ اپنی بھیانک زندگی میں اس قدر پھنس گیا کہ وہ اپنی تمام تر عمر صرف کرنے کے بعد بھی نائب مدرس ہی رہا۔ مگر لاطینی سے جو اسے محبت تھی وہ بدستور قائم رہی بلکہ ایک جنون کی طرح اس کے سر پر سوار رہی۔ اس نے شعرا کے کلام اور نثر نگاروں کی نثر اور تاریخ کے مطالعہ اور اسکی تشریح اور معانی الفاظ اور تفسیر مطالب میں وہ انہماک اور استقلال دکھایا جسے دیوانگی کہنا بجا ہوگا۔

ایک دن اس نے یہ سوچا کہ وہ اپنی جماعت کے تمام طالب علموں کو مجبور کرے گا کہ وہ اس کے تمام سوالات کا لاطینی میں جواب دیں۔ اور وہ اپنے فیصلہ پہ قائم رہا یہاں تک کہ اس کے شاگرد اس قابل ہو گئے کہ اس کے ساتھ لاطینی میں ایسی ہی مربوط گفتگو کر سکیں جیسی کہ وہ اپنی مادری زبان میں کر سکتے تھے۔ وہ ان کو ایسے سنتا تھا۔ جیسے آرکسٹرا کا لیڈر موسیقاروں کو سنتا ہے جب کہ وہ مشق کر رہے ہوتے ہیں۔ کبھی وہ اپنا رول ڈیسک

پر مار کر کہتا "موسیو نو فریغ! تم غلطی کر رہے ہو تم گرامر کے قواعد بھول رہے ہو" "موسیو پلانتل تم لاطینی اس طرح برتتے ہو جیسے کہ یہ فرانسیسی ہے تمہیں زبان کے مزاج کو سمجھنا چاہیئے۔ دیکھو۔ ذرا مجھے سنو"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس مدرسے کے طالب علموں نے مضمون نگاری، ترجمہ اور لاطینی بول چال کے تمام انعامات حاصل کر لئے۔

اگلے سال مدرسے کے پرنسپل نے جو بندر کی طرح ہوشیار اور شکل و صورت میں بھی اسکے مشابہ تھا، اپنے پروگرام، اشتہار اور اپنے مدرسے کے دروازے پر یہ لکھ دیا۔

"یہاں لاطینی کا امتیازی مطالعہ ہوتا ہے۔ مدرسے کی پانچ جماعتوں نے پہلے پانچ انعامات حاصل کئے۔"

"دو انعامات پورے فرانس کے ساتھ بمقابلہ میں حاصل کئے گئے"

دس سال سے اس مدرسے کو ایسی ہی شاندار کامیابی حاصل ہو رہی تھیں۔ چنانچہ میرے والد نے مجھے یہاں پڑھنے کے لئے بھیج دیا۔ بلکہ پانچ فرانک فی گھنٹہ کے حساب سے فادر پکدان کی ٹیوشن بھی رکھ دی۔ ان پانچ فرانکوں میں سے تین تو پرنسپل کو ملتے تھے اور دو موسیو پکدان کو۔ میں اٹھارہ برس کا تھا۔ اور فلسفہ پڑھتا تھا۔

میں یہ ٹیوشن ایک چھوٹے سے کمرے میں پڑھتا تھا۔ جو

ایک بازار کے بالمقابل تھا۔ مگر فادر پکدان نے بجائے لاطینی بولنے کے فرانسیسی زبان میں اپنی مشکلات مجھ سے بیان کرنی شروع کر دیں۔ چونکہ بیچارے کا نہ تو رشتہ دار تھا اور نہ کوئی دوست اس لئے اس کو میرے ساتھ لگاؤ ہو گیا اور اس نے مجھے اپنا دکھ درد سنانا شروع کر دیا۔

اس نے پچھلے دس پندرہ سالوں میں کسی سے بھی اپنے دل کی بات نہ کی تھی۔

"میں اس درخت کی طرح ہوں جو صحرا میں تنہا ہو" اس نے کہا دوسرے استاد اس سے بیزار تھے۔ چونکہ اسے کسی کو شناسا بنانے کی آزادی نہ تھی اس لئے وہ شہر میں کسی کو بھی نہ جانتا تھا۔ "میرے دوست رات کو بھی مجھے سکون میسّر نہیں۔ میری انتہائی تمنا یہ ہے۔ کہ میرا اپنا کمرہ ہو جس میں میرا فرنیچر اور میری کتابیں ہوں اور وہ اشیاء ہوں جو میری ہوں اور جنہیں اور کوئی نہ چھو سکے۔ مگر میرا تو کچھ بھی نہیں ہے سوائے اس کوٹ اور قمیص کے۔ تکیہ اور گدا تک تو میرا اپنا نہیں۔ مجھے چار دیواری میسّر نہیں جن میں بند ہو سکوں سوائے اس وقت جبکہ میں تمہیں یہاں پڑھانے آتا ہوں۔ سمجھتے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ ایک انسان بغیر حقوق کے زندگی بسر کر رہا ہے اسے اتنا بھی حق نہیں ہے کہ وہ تن تنہا اپنے آپ کو کسی کمرے میں بند کر سکے۔ جہاں بیٹھ کر وہ سوچ سکے۔ کام کر سکے اور مستقبل

کے سنہرے خواب دیکھ سکے۔

میرے عزیز! دروازے کی چابی ایک بہت بڑی نعمت اور وجہ شادمانی ہے۔ وہ چابی جس سے انسان اپنے کمرے کا دروازہ کھول سکتا ہے... وہ چابی ہی تو دنیا میں واحد خوشی ہے۔ ان بیہودہ بچوں کے ساتھ دن بھر مغز مارنا اور رات کو انہیں لڑکوں کے ساتھ ڈارمیٹری میں سونا اور ان کے خراٹے سننا ہی اپنا مقسوم ہے۔ لڑکوں کے بستروں کی دو قطاروں کے آخر میں میرا بستر ہوتا ہے۔ گویا بر سرِ عام سوتا ہوں۔ مجھے کبھی تخلیہ نصیب نہیں ہو سکتا۔ کبھی بھی نہیں! اگر باہر نکلوں تو بازار میں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ اور چل کر تھک جاؤں تو قہوہ خانے میں دم لینے پر مجبور ہو جاتا ہوں جہاں پہ سیگریٹ پینے والوں اور بارڈ کھیلنے والوں کا جمگھٹا ہوتا ہے۔ گویا میرے لئے مستقل اور پیہم قید ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا "موسیو کپراں! تم نے کوئی اور پیشہ کیوں نہ اختیار کیا؟"

اس نے کہا "میرے کم سن دوست! نہ تو مجھے جوتا بنانا آتا ہے اور نہ ہی ٹوپی بنا سکتا ہوں۔ میں نانبائی اور حجام بھی نہیں ہوں۔ میں تو صرف لاطینی زبان جانتا ہوں۔ میرے پاس ڈپلومہ بھی نہیں ہے۔ کہ میں اپنا علم زیادہ نرخ پہ فروخت کر سکوں۔ اگر میرے پاس پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری

ہوتی تو وہی علم جو میں دس فرانک میں بیچ رہا ہوں۔ سو فرانک میں بیچتا۔ بلکہ میں اس صورت میں گھٹیا قسم کا علم فراہم کرتا کیونکہ میرا بھرم رکھنے کے لئے میری ڈگری ہی کافی ہوتی"

کبھی کبھی وہ مجھ سے یہ کہتا "سوائے ان اوقات کے جو میں تمہارے ساتھ گزارتا ہوں مجھے کبھی چین نصیب نہیں ہوتا۔ مگر تمہیں خائف نہیں ہونا چاہئیے۔ تمہاری پڑھائی کا ہرج نہیں ہوگا۔ میں تمہیں دوسروں سے بہتر لاطینی سکھا دوں گا۔"

ایک دن میں نے بڑی جرأت دکھائی اور اُسے سگرٹ پیش کیا۔ پہلے تو اس نے حیرت سے مجھے گھورا اور پھر دروازے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میرے پیارے بچے۔ اگر کوئی اندر آ گیا تو کیا ہوگا!"

"کوئی بات نہیں۔ چلئے کھڑکی کے قریب کھڑے ہو کر پیتے ہیں" میں نے جواب دیا۔

ہم دونوں کھڑکی کے پاس گئے اور سل پر کہنیاں ٹیک کر جھکے ہوئے انداز میں کھڑے ہو گئے کھڑکی بازار کے بالمقابل تھی۔ ہم سگرٹوں کو اپنے ہاتھوں میں چھپائے رکھا۔ گویا وہ بندوق کی گولیاں تھیں۔ ہمارے عین سامنے ایک لانڈری تھی۔ چار عورتیں سفید کرتے پہنے کپڑے استری کر رہی تھیں اور

بھاپ ان کے جسموں کے قریب سے اٹھتی تھی۔

اچانک ایک اور عورت ایک بڑی ٹوکری اٹھائے ہوئے لانڈری سے باہر نکلی۔ بوجھ سے اسکی کمر جھکی ہوئی تھی اور گاہکوں کے لئے ان کی قمیضیں شمیضیں رومال اور چادریں لائی تھی اور وہ دہلیز کے قریب رک گئی اور تھکاوٹ کا اظہار کیا۔ پھر اس نے آنکھیں اٹھا کہ ہمیں سگرٹ پیتے دیکھا۔ اور مسکرا دی۔ اور دُور سے ہاتھ کے اشارہ سے ہمیں بوسہ دیا۔ یہ دزدانہ بوسہ آزاد اور بے تکلف زندگی لبسر کرنے والی مزدوری پیشہ عورتوں کا خاصہ ہے اس کے بعد وہ آہستہ خرامی سے اپنی جوتیاں گھسیٹتی ہوئی ہمارے سامنے سے گذر گئی۔

وہ بیس سالہ دوشیزہ تھی۔ دبلی پتلی اور زرد تھی مگر پیاری صورت رکھتی تھی۔ اس کے اطوار بالکل ویسے ہی تھے جیسے بازار میں کام کرنے والی عام عورتوں کے ہوتے ہیں۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور آنکھوں میں ہنسی کی چمک تھی۔

فادر ریکیدان نے متاثر ہو کر کہا۔

"کیا یہ بھی کوئی ایسا پیشہ ہے جسے عورت اختیار کر سکے۔ یہ کاروبار تو گھوڑے کے لئے بہت موزوں ہے"

اس نے بڑے درد بھرے انداز میں عوام کی مصیبتوں کا ذکر کیا۔

اس کا دل جمہوریت کے اعلیٰ جذبات سے پُر تھا اور وہ مزدور طبقہ کی تھکا دینے

والی محنت و مشقت کا ذکر مشہور و معروف مفکر روسو کے فقرے دہرا کر کرتا تھا اور آہیں بھی بھرتا جاتا تھا۔

دوسرے دن جب کہ ہم کھڑکی کے پاس کھڑے تھے تو اُسی مزدور عورت نے ہمیں دیکھ کر کہا۔ "السلام علیکم! اے میرے تعلیم یافتہ دوستو" اس کے لہجہ میں مذاق شامل تھا۔ اور اس نے نفرت آگیں اشارہ بھی کیا۔

میں اسکی طرف ایک سگریٹ پھینکا جسے وہ فوراً ہی پینے لگی باقی چار عورتیں بھی ہاتھ پھیلائے سگریٹ مانگنے کے لئے لپکیں۔ اب تو فٹ پاتھ پر کام کرنے والی عورتوں اور بورڈنگ ہاؤس کے بے فکروں کے تعلقات دن بدن بڑھنے لگے۔

فادر پکداں کی حالت تو بالکل مضحکہ خیز تھی۔ اگر اُسے کوئی دیکھ لیتا تو وہ کانپنے لگتا کیونکہ اُسے نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خطرہ تھا۔ اس کے بزدلانہ اشارے دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ وہ اپنی محبت کا اظہار تھیٹر کے نقال کی طرح کرتا تھا جس کے جواب میں عورتیں بوسوں کی چاند ماری شروع کر دیتی تھیں۔

مجھے ایک عجیب شرارت سوجھی۔ ایک دن کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میں نے آہستہ سے نائب معلم سے کہا۔ "شاید آپ کو یقین نہ آئے میں اس چھوٹی سی کپڑے دھونے والی عورت سے ملا ہوں۔ وہی نہ جو اس دن ٹوکری اٹھائے

لئے جا رہی تھی۔ میں نے اس سے بات چیت بھی کی ہے۔"

میرے اس لہجہ نے اس کے جذبات برانگیختہ کر دیئے اور وہ پوچھنے لگا۔ "اس نے تم سے کیا کہا تھا۔"

"اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ بہت ہی اچھے ہیں۔ میرا خیال ہے اسے آپ سے کچھ محبت ہو گئی ہے۔" اس کا رنگ اڑ گیا۔ اور اس نے کہا:

"وہ میری ہنسی اڑا رہی ہے۔ میری عمر کے آدمی کے ساتھ ایسا ہونا ممکن نہیں"۔

میں نے سنجیدگی سے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ واقعی بہت اچھے ہیں۔"

چونکہ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میری چال کامیاب ہو گئی ہے اس لئے میں نے بات کو زیادہ طول نہ دیا۔ لیکن ہر روز میں یہی ظاہر کرتا تھا کہ میں لانڈری والی سے ملا ہوں اور میں نے اس کے متعلق اس سے گفتگو کی ہے۔ آخرکار اسے میری بات کا یقین ہو گیا اور وہ اس لڑکی کو محبت بھرے بوسوں کے اشارے کرنے لگا۔

ایک دن تو وہ مجھے سچ مچ ہی سکول جاتے ہوئے راستے میں مل گئی۔ میں بے جھجک اس کے ساتھ ہو لیا گویا کہ میں اسے گذشتہ دس سال سے جانتا تھا۔

"محترمہ! سلام علیکم۔ آپکے مزاج کیسے ہیں۔"

"مسٹر! بالکل بخیر ہیں۔ آپ کا شکریہ"

"کیا آپ سگریٹ نوش فرمائینگی؟"

"نہیں۔ میں بازار میں سگریٹ نہیں پی سکتی"

"آپ اسے گھر پر ہی پی لیجئے گا"

"اس صورت میں تو میں پی ہی سکتی ہوں"

"مس، میں تمہیں بتاؤں کہ تمہیں ایک بات کی بالکل خبر نہیں ہے"

"مسٹر! وہ کونسی بات ہے"

"وہ ادھیڑ عمر کا شریف آدمی۔ یعنی میرا مطلب ہے میرا بزرگ استاد"

"فادر پکیڈال"

"جی ہاں۔ فادر پکیڈال۔ تو گویا آپ ان کا نام جانتی ہیں"

"ہاں میں جانتی ہوں۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"وہ آپ سے محبت کرتا ہے"

وہ مجنون عورت کی طرح کھل کھلا کر ہنس پڑی

"یہ محض خرافات ہے" اس نے کہا

"یہ خرافات نہیں ہے۔ وہ سبق پڑھاتے ہوئے تمام وقت تمہارے

متعلق گفتگو کرتا رہتا ہے۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے "!

اُس نے ہنسی ضبط کر لی۔ شادی کا خیال ہر لڑکی کو سنجیدہ بنا دیتا ہے۔ پھر اس نے بے یقینی سے کہا:

"یہ سب خرافات ہے"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ درست ہے۔"

اس نے اپنے پاؤں کے قریب رکھی ہوئی ٹوکری اٹھاتے ہوئے کہا:

"اچھا دیکھا جائے گا"، اور یہ کہہ کر وہ چلی گئی میں نے سکول پہنچتے ہی فادر ریکیراں سے کہا "آپ کو چاہیئے کہ اُسے محبت نامہ بھیجیں۔ وہ آپ سے دیوانہ وار محبت کرتی ہے۔

اُس نے اُسے ایک طویل اور ملائم خط لکھا جو تشبیہات، استعارات فلسفہ اور کتابی محبت سے بھرپور تھا اور میں نے یہ خط خود اس نوجوان لڑکی کو دینے کی ذمہ داری قبول کی۔

اس نے یہ خط سنجیدگی سے اور جذبات سے پُر ہو کر پڑھا اور پھر کہنے لگی "وہ کتنا اچھا لکھتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ تعلیم یافتہ ہے۔ کیا وہ واقعی مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے؟"

میں نے بڑی ہوشیاری سے جواب دیا "بخدا وہ تمہارے پیچھے

دیوانہ ہو گیا ہے "

" پھر تو اسے اتوار کے دن مجھے ایل دے فلور میں دعوتِ طعام دینی چاہیئے "

میں نے اس سے وعدہ کیا کہ دعوت کا انتظام کیا جائے گا۔

میں نے فادر ریکیداں کو جو کچھ بھی اس کے متعلق بتایا تھا۔ اس سے اس کے دل میں اسکی محبت اور بھی زیادہ جاگزیں ہو گئی۔

میں نے کہا " موسیو ریکیداں! وہ آپ سے محبت کرتی ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ شریف لڑکی ہے ۔ اور کسی شریف لڑکی کو مطلب نکال کر چھوڑ دینا شرافت سے بعید ہے ۔ " اس نے بڑے اعتماد سے کہا :

" میرے دوست! میں بھی ایک شریف آدمی ہوں "

میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس وقت میرے دماغ میں کوئی سکیم نہ تھی میں کچھ بھی کر رہا تھا وہ ایک طالب علم کے عملی مذاق سے زیادہ کچھ بھی نہ تھا مجھے نائب المدرس کی سادگی ، معصومیت اور کمزوری کا پورا علم تھا میری عمر اٹھارہ سال تھی اور سکول میں عملی مذاق کرنے والا طالب علم سمجھا جاتا تھا۔

پس ہم نے طے کر لیا کہ موسیو ریکیداں اور میں ایک گاڑی میں کیو دو ٹی سیر گاہ کی طرف جائیں گے ۔ وہاں ہم انگیل رید اس لڑکی کا نام تھا) کو اپنے ساتھ لے لیں گے اور میں انہیں وہاں اپنی کشتی میں سیر کراؤں گا

کیونکہ اس زمانے میں مَیں کشتی چلانے کا بہت شوقین تھا۔ اس کے بعد میں انہیں ایل دو فلوریس لے جاؤں گا۔ جہاں پہ کہ ہم اکٹھے کھانا کھائیں گے۔ میں نے اس ملاقات پر اپنی موجودگی لازمی قرار دے دی تھی تاکہ میں اپنی فتح مندی کا لطف اٹھا سکوں۔ اور نائب مدرس نے مجھے اجازت دے کر اپنے پاگل پن کا بین ثبوت دے دیا تھا کیونکہ اسکی نوکری خطرے میں پڑ گئی تھی۔

جب ہم کشتی کے قریب پہنچے تو میں نے دریائے کے کنارے پہ اگی ہوئی لمبی لمبی گھاس میں سرخ رنگ کا سن شیڈ دیکھا جو کہ گل لالہ سے ملتا جلتا تھا۔ اس چھتر کے نیچے لانڈری میں کام کرنے والی لڑکی اتوار کے ملبوس میں منتظر تھی۔ مجھے بہت حیرت ہوئی وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

فادر پکداں نے اپنا ہیٹ اتارا اور تعظیم کے لئے جھکا۔ اس لڑکی نے اپنا ہاتھ اسکی طرف بڑھایا اور دونوں نے بغیر کچھ کہے ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ میری کشتی میں سوار ہو گئے اور میں نے چپو تھام لئے۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ نائب مدرس نے گفتگو کی ابتدا کی:

"یہ موسم کشتی کی سیر کے لئے بہت موزوں ہے"

"جی ہاں" اس نے جواب دیا

وہ اپنے ہاتھ سے پانی کو چھیڑ رہی تھی۔ اس نے اپنی انگلیاں

پانی میں پیوست کر کے شیشہ سے ملتی جلتی چھوٹی سی ندی بنائی جو چلتی ہوئی کشتی کے ساتھ ساتھ ہلکی سی آواز پیدا کر رہی تھی۔

ہوٹل میں اس نے ڈنر کے احکام جاری کرنے اور گفتگو کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ یہ ڈنر تلی ہوئی مچھلی۔ چکن اور سلاد پر مشتمل تھا۔ پھر وہ ہمیں جزیرے کی طرف لے گئی کیونکہ وہ اس کا اچھی طرح دیکھا بھالا ہوا تھا۔

وہ بہت خوش تھی۔ اور ہنسی مذاق اور کھیل کود میں مصروف تھی۔ ڈنر کے بعد پھل وغیرہ کھانے کے وقت تک بھی محبت کی بات نہ چھڑ سکی تھی۔ میں نے انہیں شمپین پلائی تھی اور رفاور یکدال سرور کے عالم میں تھا۔ وہ قدرے جوش میں آ کر اُسے موسیو پکنے کہہ کر پکار اٹھی اس نے فوراً ہی جواباً کہا "محترمہ! مسٹر غاؤول نے میرے جذبات آپ تک پہنچا دیئے ہیں"

اس پہ وہ ایک جج کی طرح سنجیدہ ہو گئی اور کہا:

"ہاں جناب"

"کیا آپ اس کے بارے میں کوئی جواب دیں گی"

"ہم ان سوالوں کا کبھی جواب نہیں دیتے"

وہ جذبات سے بے قابو ہو کر بولا" ایک نہ ایک دن میں تمہیں

بھی اپنے جیسا بنا لوں گا "

وہ مسکراتے ہوئے بولی " ارے نرے احمق ! تم بہت ہی اچھے ہو "

" مختصراً یہ کہ محترمہ کیا آپ خیال کرتی ہیں کہ ہم بعد میں شاید ...... "

وہ ایک سیکنڈ کے لئے جھجکی - پھر کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگی " کیا تم یہ سب کچھ میرے ساتھ شادی کرنے کے ارادے سے کہہ رہے ہو ؟ ورنہ اس کے بغیر کبھی کچھ اور نہیں ہو سکتا - جیسا کہ تم خود سمجھ سکتے ہو - "

" ہاں محترمہ "

" خوب ! پھر تو بالکل درست بات ہے - موسیو پکدان ! "

اس طرح ان دو احمقوں نے ایک بے فکرے طالب علم کے جھانسے میں آ کر ایک دوسرے سے شادی کا وعدہ کیا - مگر مجھے اس وعدہ کے سنجیدہ ہونے کا یقین نہ تھا - شاید ان دونوں کو بھی یقین نہیں تھا -

جہاں تک لڑکی کا تعلق تھا اُسے کسی قدر تامل تھا

" تمہیں پتہ ہے میرے پاس کچھ نہیں ہے - چار سُو (ایک معمولی سکہ کا نام جو چند پیسوں کے برابر ہوتا) (SOUS) بھی نہیں ہیں "

کیونکہ وہ نشے میں تھا اس لئے اس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا :

" میں نے پانچ ہزار فرانک جمع کر رکھے ہیں "

وہ فتحمندانہ انداز میں بولی "ہم انہیں کاروبار میں لگا سکتے ہیں "

وہ بے قرار ہو کر بولا "کونسا کاروبار ؟"

" میں اس کے متعلق کیا کہہ سکتی ہوں ۔ پانچ ہزار فرانک کے ساتھ ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں ۔ تم مجھے اپنے بورڈنگ سکول میں سے جانے کا ارادہ تو نہیں رکھتے ؟ یا کچھ ایسا ہی خیال ہے ؟ "

اس نے یہ سب کچھ نہیں سوچا تھا اس لیے ہکلاتے ہوئے بولا :

" ہم کونسا کاروبار کر سکتے ہیں ؟ یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا میں تو صرف لاطینی ہی جانتا ہوں "

اس نے غور کرنا شروع کیا ۔ ان تمام پیشوں کے متعلق سوچا جنکی کبھی اس نے خواہش کی تھی ۔

" آپ ڈاکٹر نہیں بن سکتے ہیں "

" نہیں میرے پاس ڈپلومہ نہیں ہے "

" کیا کیمسٹ بن سکتے ہیں ؟ "

" نہیں "

وہ خوشی سے چیخ اٹھی ۔ اس نے پیشہ دریافت کر لیا تھا ۔

" پھر ہم کریانے کی دوکان کھول لیں گے ۔ کیسی خوش قسمتی کی بات ہے ! ہم کریانے کی دوکان خریدیں گے ۔ بڑی دکان نہیں ۔ کیونکہ پانچ ہزار فرانک سے کوئی

بڑا کاروبار نہیں ہو سکتا ،،

اس تجویز کو سن کر اس کے وقار کو دھکا لگا۔

"نہیں میں سوداگر فروش نہیں بن سکتا - میں بہت مشہور و معروف ہوں۔ میں صرف لاطینی جانتا ہوں۔ اور میں صرف یہی جانتا ہوں ،،

مگر اس نے شمپین کا گلاس اس کے گلے کے نیچے اتار دیا اور وہ اسے پی کر خاموش ہو گیا۔

ہم دوبارہ کشتی میں سوار ہوئے ۔ رات بہت تاریک تھی۔ تاہم میں نے دیکھا کہ اس نے لڑکی کو کمر سے پکڑا ہوا تھا اور وہ بار بار ایک دوسرے سے بوس و کنار کر رہے تھے۔

اس کھیل کا انجام نہایت خطرناک ہوا۔ ہمارے سکول سے فرار ہونے کا سب کو پتہ چل گیا۔ اور فادر ریکدان کو نوکری سے برطرف کر دیا گیا۔ اور میرے والد نے ناراض ہو کر مجھے ربادے نامی کسی اور سکول میں فلسفہ کی تعلیم کی تکمیل کے لئے بھیج دیا۔

چھ مہینے بعد میں نے بی۔ اے کا امتحان پاس کر لیا۔ اور پیرس میں قانون پڑھنے کے لئے چلا گیا ۔ اور میں دو سال سے پہلے اپنے آبائی قصبہ میں واپس نہ جا سکا۔

سرنیٹ سٹریٹ کے کونے پر مجھے ایک دکان دکھائی دی۔ دروازے پر

یہ الفاظ لکھے تھے: "نو آبادیاتی اشیا- یکدان" پھر اسکے نیچے کم علم لوگوں کے لئے لکھا تھا: "کریانے کی دکان"

میں نے لاطینی زبان کا ایک فقرہ چست کیا اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اپنی گاہک عورت کو چھوڑ دیا اور میری طرف لپکا۔

"اے میرے نوجوان دوست- خوب ملاقات ہوئی- کتنی خوش قسمتی کی بات ہے!"

ایک خوبصورت اور موٹی عورت جلدی سے ادائیگی کی میز چھوڑ کر باہر نکلی اور مجھ سے لپٹ گئی- مجھے اُسے پہچاننے میں قدرے دشواری پیش آئی۔ کیونکہ وہ خاصی موٹی ہو گئی تھی-

میں نے پوچھا: "کہیئے خوب گزر رہی ہے؟"

یکداں اشیاء کو تولنے کے لئے دکان پر واپس چلا گیا تھا۔ اس کی بیوی نے جواب دیا۔

"جی ہاں- بہت خوب! بڑے مزے سے گزر رہی ہے- میں نے اس سال پورے تین ہزار فرانک کا نفع کمایا ہے-"

میں نے موسیو یکداں سے پوچھا:

"موسیو! کہیئے آپ کے لاطینی کے شوق کا کیا ہوا؟"

"ارے میاں! جانے بھی دو- لاطینی ——

لاطینی سے ہنڈیا نہیں پکتی ۔ "

سائمن کے ابا

دوپہر کی گھنٹی بجی۔ سکول کا دروازہ کھلا۔ لڑکوں کا ہجوم باہر نکلا۔ جلدی سے نکلنے کی کوشش میں وہ ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ مگر فوراً گھر ڈنر پہ پہنچنے کی بجائے وہ چند قدم کے فاصلے پر رک گئے اور مختلف گروہوں میں بٹ کر باہم سرگوشیاں کرنے لگے۔

بات دراصل یہ تھی کہ لابلاں شوت کا بیٹا پہلی مرتبہ سکول میں آیا تھا ان سب نے اپنے اپنے گھروں میں لابلاں شوت کا تذکرہ سنا تھا۔ اگرچہ

ظاہری طور پہ لوگ اُسے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ لیکن جب مائیں آپس میں ملتیں تو اسکے ساتھ ایسی ہمدردی کا اظہار کرتیں جس میں کسی قدر نفرت کی آمیزش بھی ہوتی۔ اس کا لڑکوں کو احساس ہو گیا تھا۔ اگرچہ انہیں اس کی وجہ معلوم نہ تھی۔

جہاں تک خود سائمن کی ذات کا تعلق ہے۔ وہ اُسے نہیں جانتے تھے کیونکہ وہ کبھی بھی ان کے ساتھ دیہات کے گلی کوچوں میں یا دریا کے کنارے کھیلنے نہیں نکلا تھا۔ اس لئے ان کو اس سے کوئی محبت نہ تھی۔ وہ حیرت آمیز خوشی کے جذبہ کے ساتھ ٹولیاں بنا کر اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے ایک فقرہ دہرا رہے تھے جو کہ ایک چودہ یا پندرہ سال کے لڑکے نے گھڑ لیا تھا اور اس لڑکے کے مدبرانہ انداز میں آنکھ مارنے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے راز کی خبر ہے۔ فقرہ یہ تھا "آپ سائمن کو جانتے ہیں ——— ہاں" تو اس کا کوئی آبا نہیں ہے۔"

بالآخر لابلاں شوٹ کا بیٹا بھی سکول کی دہلیز پہ دکھائی دیا۔ اسکی عمر سات یا آٹھ سال تھی۔ وہ قدرے زرد رنگ بہت صاف ستھرا تھا اسکے اطوار سے بزدلی اور عدم اعتماد مترشح تھا۔

واپسی پہ وہ اپنی ماں کے گھر جا رہا تھا کہ لڑکوں نے جو کہ شرارت آمیز اور بے رحم نگاہوں سے اسے پیہم دیکھ رہے تھے۔ اور اسے تنگ کرنے

پر آمادہ تھے بالتدریج اُسے گھیرنا شروع کیا اور آخرکار اُسے بالکل گھیرے میں لیکر بند کر لیا۔ وہ ان کے درمیان حیران و پریشان کھڑا تھا۔ اسکی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ مگر خبر لانے والا لڑکا جو اپنی اس کامیابی پہ پھولا نہ سماتا تھا بولا: "تم کیا کہلاتے ہو؟"

اُس نے جواب دیا "سائمن"

"سائمن کیا؟" لڑکے نے پوچھا

سائمن نے جو کہ بالکل پریشان ہو گیا تھا جواب دیا "سائمن"

لڑکے نے چیخ کر کہا "تمہارے نام سائمن کے ساتھ کسی اور کا نام بھی ہونا چاہیئے۔ نرا سائمن تو کوئی نام نہیں ہوتا"

اس نے رونی صورت بنا کر جواب دیا۔ "میرا نام سائمن رکھا گیا ہے"

شرارتی بچوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ بچے اس غیر معمولی اور بھیانک چیز کو دیکھ کر حیران تھے ——— ایک لڑکا جس کا کوئی باپ نہ تھا اور اسے ایک عجوبہ اور غیر فطری چیز سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنے اندر اپنی ماؤں والا لاں بلاں ثبوت کے لئے ناقابل وضاحت رحم کا جذبہ ابھرتا ہوا محسوس کیا۔ بیچارے سائمن نے گھرنے سے بچنے کے لئے ایک درخت کا سہارا لے لیا اور وہ وہاں ایسے کھڑا تھا جیسے کسی ناقابل تلافی تباہی نے اُسے شل کر دیا ہو۔ اس نے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی مگر کوئی جواب

بن نہ پڑا اور اس خوف ناک الزام سے کہ اس کا کوئی باپ نہیں ہے انکار کی کوئی صورت نظر نہ آئی - آخر وہ تنگ آ کر چیخ اٹھا "ہاں - میرا باپ ہے"

"وہ کہاں ہے" لڑکے نے پوچھا

سائمن خاموش ہو گیا - لڑکوں نے چیخنا شروع کیا وہ بہت زیادہ جوش میں آ گئے تھے - ان محنت کشوں کے لڑکوں نے جو کافی حد تک جانوروں سے رشتہ رکھتے ہیں وہی ظالمانہ اکساہٹ محسوس کی جو کسی پولٹری فارم کے مرغ اور مرغیوں کو اپنے ہم جنس کو جبکہ وہ زخمی ہو جاتا ہے تباہ کرنے پہ آمادہ کرتی ہے - اچانک سائمن کو اپنا ایک ننھا سا ہمسایہ نظر آیا جو کہ ایک بیوہ کا لڑکا تھا اور جسے اس نے اپنی ہی طرح ہمیشہ اس کی ماں کے ساتھ ہی دیکھا تھا -

"تمہارا بھی تو کوئی ابا نہیں ہے" اس نے اپنے ننھے ہمسایہ سے کہا۔

"ہاں" میرا ایک ابا ہے" اس نے بتایا

"وہ کہاں ہے؟" سائمن نے پوچھا

"وہ مر چکا ہے - وہ قبرستان میں ہے -" لڑکے نے بڑی شان کے ساتھ اعلانیہ کہا -

نادانوں نے صدائے تحسین بلند کی - گویا سائمن کو شکست دینے

کے لئے ان کے ساتھی کے باپ کا قبرستان میں مردہ ہونا ایک بہت بڑی حقیقت تھی کیونکہ سائمن کا تو سرے سے باپ تھا ہی نہیں۔ یہ بدمعاش لڑکے جن میں سے اکثر کے باپ بدکردار، شرابی، چور اور اپنی بیویوں سے بدسلوکی سے پیش آنے والے تھے ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے سائمن کے قریب تر ہو گئے گویا کہ وہ جو اپنے آپ کو از روئے قانون حلال زادے سمجھتے تھے خلاف قانون سائمن کو مسل کر رکھ دیں گے۔

سائمن کے قریب کھڑے ہوئے لڑکے نے اپنی زبان از رہ شرارت باہر نکالی اور کہنے لگا۔ " ابا ندارد ۔۔۔ ! ۔۔۔۔ ابا ندارد "

سائمن نے دونوں ہاتھوں سے اسکے بال پکڑ لئے اور پاؤں کی ٹھوکروں سے اُسے گرانے کی کوشش کرنے لگا۔ جبکہ لڑکے نے اسکے گال پہ کاٹا دونوں لڑکوں کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی۔ سائمن کو خوب مار پڑی اور اس کے چوٹیں آئیں اور اس نے اپنے آپ کو زمین پہ لڑھکتے ہوئے پایا جبکہ دوسرے لڑکے صدائے تحسین بلند کر رہے تھے۔ جب وہ اپنی چھوٹی سی قمیص سے گرد جھاڑتا ہوا اٹھا تو ایک لڑکے نے چلا کر کہا " جاؤ اور اپنے باپ کو بتاؤ۔ "

اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ اس سے زیادہ طاقتور تھے انہوں نے اسے پیٹا بھی تھا۔ اور وہ انہیں کوئی جواب نہ دے سکا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا

کہ اُس کا کوئی باپ نہیں ہے۔ مگر وہ خودداری قائم رکھنے کے لئے اپنے آنسوؤں کو روکے ہوئے تھا اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ سسکیاں بھر کر رونا شروع کیا۔ اس کے دشمنوں نے وحشیانہ خوشی کا اظہار کیا۔ اور اُنہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دائرہ بناتے ہوئے رقص کیا اور وہ بار بار یہی دہرا رہے تھے " ابا ندارد ..... ابا ندارد

مگر اچانک ہی سائمن نے سسکیاں لینا بند کر دیا۔ اس پر دیوانگی مسلط ہو گئی۔ اس کے پاؤں کے قریب پتھر پڑے ہوئے تھے اس نے تانے والوں پر پورے زور کے ساتھ پتھراؤ شروع کر دیا۔ دو تین کے پتھر لگے اور وہ چیخیں مارتے ہوئے بھاگ نکلے۔ وہ اس قدر خوفناک معلوم ہو رہا تھا کہ باقی ماندہ بھی بدحواس ہو گئے۔ بزدل کہیں کے۔ وہ اس ہجوم کی طرح تھے جو ایسے شخص کا مذاق اڑاتا ہے جس کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہو وہ سب کے سب بھاگ نکلے۔ جب وہ اکیلا رہ گیا تو اس نے کھیتوں کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ ایک یاد نے اسے ایک بڑا قدم اٹھانے پر آمادہ کر دیا تھا اس نے دریا میں ڈوب مرنے کا عزم کر لیا۔

اُسے یاد آیا کہ آٹھ دن پہلے ایک مفلس نے ناداری سے تنگ آ کر اپنے آپ کو دریا کی موجوں کے حوالے کر دیا تھا۔ سائمن نے اسکی لاش دیکھی تھی۔ اس کا زرد چہرہ، اسکی تر الود داڑھی اور اسکی کھلی ہوئی آنکھیں

پرسکون تھیں۔ یہ دردناک منظر اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ تماشائیوں نے کہا تھا "وہ مر گیا ہے"

اور کسی نے یہ بھی کہا تھا کہ "وہ اب بالکل خوش ہے"

سائمن ڈوبنا چاہتا تھا کیونکہ اس کے پاس باپ نہیں تھا۔ بعینہ اس مفلس کی طرح جس کے پاس روپیہ نہیں تھا وہ پانی کے قریب پہنچ گیا اور اسکے بہاؤ کو دیکھنے لگا۔ مچھلیاں پانی میں تیزی سے تیر رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ اچھل کر مکھیاں پکڑ لیتی تھیں۔ وہ رونا بند کر کے انہیں دیکھنے لگا کیونکہ ان کے خوراک حاصل کرنے کا انداز اُسے بے حد دلچسپ معلوم ہوا۔ مگر وقفوں کے بعد، بعد از طوفان سکون کی طرح جبکہ درختوں کو توڑ دینے والے جھونکے ناپید ہو جاتے ہیں یہ خیال شدتِ درد کے ساتھ بار بار اس کے ذہن میں آتا تھا —— "میں ڈوبنے لگا ہوں کیونکہ میرا کوئی باپ نہیں ہے"

موسم بہت حسین تھا۔ خوشگوار دھوپ نے گھاس میں حرارت پیدا کر دی تھی۔ پانی آئینہ کی طرح صاف تھا۔ اور چند لمحوں کے لئے رونے کے بعد پیدا ہوئے والے سکون کا لطف اٹھانے لگا۔ اس کے دل میں وہیں سو جانے کی خواہش پیدا ہوئی ایک سبز مینڈک اس کے پاؤں کے قریب اچھلا اس نے اسکو پکڑنے کی کوشش کی۔ مگر وہ بچ نکلا۔ اس نے تین مرتبہ

اس کا پیچھا کیا - مگر مینڈک ہاتھ نہ آیا - آخر اس نے اسے پچھلی ٹانگوں سے پکڑ ہی لیا اور اس کے بیچ نکلنے کی کوشش پر ہنسنے لگا - مینڈک اپنی لمبی ٹانگوں پر ایستادہ ہوا اور پھر انہیں اکڑا کر سلاخ کی طرح سخت کر لیا - اسکی آنکھیں اپنے گول، کشادہ اور سنہری دائرہ میں گھور رہی تھیں اور وہ اپنے اگلے پاؤں سے ہوا میں چلا رہا تھا گویا وہ اس کے ہاتھ تھے - اسے ایک کھلونا یاد آیا جو لکڑی کے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر بنایا گیا تھا - ان ٹکڑوں پر فوجی بنائے گئے تھے یہ ٹکڑے مینڈک کی طرح حرکت کرتے تو فوجیوں کی ورزش کا منظر سامنے آجاتا تھا - پھر اُسے اپنی ماں اور اپنے گھر کا خیال آیا - غم سے مغلوب ہو کر اُس نے پھر رونا شروع کر دیا - اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے - اس نے دوزانو ہو کر دعا مانگی جیسے کہ سونے سے پہلے مانگی جاتی ہے - مگر وہ دعا کی تکمیل نہ کر سکا - کیونکہ وہ سسکیوں کی شدت سے مغلوب ہو گیا تھا - اب اس کے دماغ میں کوئی خیال نہ تھا وہ زار و قطار رو رہا تھا -

اچانک کسی نے اپنا بوجھل ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ کر بھاری آواز میں پوچھا "میرے عزیز تم اس قدر غمزدہ کیوں ہو؟"

سائمن نے مڑ کر دیکھا - ایک سیاہ داڑھی اور گھنگریالے بالوں والا طویل القامت، دستکار نیکدلی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ جواب دیا "انہوں نے مجھے پیٹا ہے - کیونکہ میرا کوئی

آبا نہیں ہے۔ کوئی آبا نہیں........"

"کیا؟" آدمی نے مسکراتے ہوئے کہا "کیوں، ہر ایک کا آبا ہوتا ہے۔"

لڑکے نے غم واندوہ کے عالم میں جواب دیا "لیکن میرا کوئی آبا نہیں ہے۔"

دستکار سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے لابلاں شوت کے لڑکے کو پہچان لیا تھا۔ اگرچہ وہ نووارد تھا مگر اُسے اس عورت کی داستانِ حیات کا مبہم سا حال معلوم ہو چکا تھا۔

اس نے کہا "میرے بچے! اپنے دل کو تسلی دو۔ اور میرے ساتھ اپنی ماں کے گھر چلو۔ وہ تمہیں آبا دے دیگی"

دونوں چل پڑے۔ بڑے نے چھوٹے کا ہاتھ تھام لیا۔ دستکار مسکرا رہا تھا کیونکہ وہ لابلاں شوت کو ملنے جا رہا تھا جو کہ لوگوں کے خیال میں گاؤں کی حسین ترین لڑکیوں میں سے تھی۔ شاید وہ اپنے دل میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس لڑکی نے ایک دفعہ غلطی کی ہے وہ دوبارہ بھی غلطی کر سکتی ہے۔

وہ سفید رنگ کے خوبصورت اور صاف ستھرے مکان کے سامنے پہنچ گئے۔

"وہ ہے مکان" لڑکے نے کہا اور اپنی امی کو پکارا

ایک عورت نمودار ہوئی -دستکار نے مسکرانا بند کر دیا- کیونکہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس زرد اور طویل قامت لڑکی کو بیوقوف بنانا درست نہیں -وہ ایسی سنجیدگی سے دروازے میں کھڑی تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک آدمی سے گھر کی دہلیز کو محفوظ رکھنا چاہتی تھی جہاں پر کہ اُسے کسی دوسرے آدمی نے دھوکہ دیا تھا- اس کا حوصلہ پست ہو گیا اور اس نے ہکلاتے ہوئے کہا " دیکھئے مادام! میں آپ کا لڑکا آپ کے پاس واپس لایا ہوں یہ دریا کے نزدیک راستہ بھول گیا تھا- "

سائمن اپنی ماں کی گردن میں بازو ڈال کر چیخنے لگا:

" نہیں امّی - میں اپنے آپ کو ڈبونا چاہتا تھا کیونکہ دوسرے لڑکوں نے مجھے پیٹا تھا - کیونکہ میرا کوئی آبا نہیں ہے "

نوجوان عورت کے رخسار سُرخ ہو گئے - صدمہ سے بے قابو ہو کر وہ لڑکے سے چمٹ گئی اور اسکی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے - دستکار کے دل پر بہت اثر ہوا اور وہ وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا - اسکی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے رخصت لے - اچانک سائمن دوڑا ہوا اس کے پاس آیا اور کہنے لگا " کیا آپ میرا آبا بن سکتے ہیں ؟

ایک گہری خاموشی طاری ہو گئی لا بلال شوت کی زباں گنگ ہو گئی اور وہ شرم کے مارے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی اور

دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام لایا۔ جب بچے کو کوئی جواب نہ ملا تو بولا "اگر آپ میرا باپ بننا نہیں چاہتے تو میں ڈوبنے کے لئے واپس چلا جاؤں گا۔"

دستکار نے اسے مذاق سمجھتے ہوئے ہنس کر کہا:

"ہاں کیوں نہیں، میں یقیناً تمہارا باپ بننا چاہتا ہوں"

لڑکے نے پوچھا: آپ کا کیا نام ہے؟ جب لڑکے مجھ سے تمہارا نام پوچھیں تو انہیں کیا بتاؤں؟

دستکار نے جواب دیا "فلپ"

سائمن چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا تاکہ اس کا نام اپنے حافظے میں محفوظ کر سکے پھر اپنے بازو پھیلاتے ہوئے مطمئن ہو کر بولا۔

"اچھا فلپ۔ آپ میرے ابا ہیں"

دستکار نے اسے زمین سے اٹھایا۔ اس کے دونوں رخساروں کا بوسہ لیا اور چلا گیا۔

جب سائمن دوسرے دن سکول گیا تو حقارت آمیز قہقہوں سے اس کا استقبال کیا گیا۔ چھٹی کے وقت جبکہ لڑکے دوبارہ یہی حرکت کرنے والے ہی تھے کہ اس نے پتھر کی طرح یہ الفاظ انکی طرف پھینکے "میرے ابا کا نام فلپ ہے"

سب نے خوشی سے چیخنا شروع کیا "کونسا فلپ؟ کیسا فلپ؟

یہ فلپ تم کہاں سے اٹھا لائے ؟"

سائمن نے کچھ جواب نہ دیا ۔ مگر وہ لازوال اعتماد کے ساتھ اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کی مخالفت پر اڑا رہا۔ اُسے اُن کے سامنے سے بھاگ جانے کے مقابلے میں کٹ مرنا زیادہ آسان معلوم ہوتا تھا۔ سکول ماسٹر کے آنے سے اسکی خلاصی ہوئی اور وہ ماں کے پاس گھر واپس آیا ۔

تین ماہ گذر گئے ۔ فلپ لابلاں شوت کے گھر کے سامنے سے اکثر گذرتا تھا اور کبھی کبھی اس سے گفتگو کرنے کی جرأت بھی کرتا تھا مگر صرف اس وقت جب وہ کھڑکی کے نزدیک بیٹھی سینے پرونے میں مصروف ہوتی۔ وہ ہمیشہ سنجیدگی اور خوش اسلوبی سے اسکی باتوں کا جواب دیتی ۔ وہ اس سے کبھی بھی کسی قسم کا مذاق نہ کرتی اور نہ ہی اُسے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دیتی مگر اس کے باوجود بھی اسے تمام آدمیوں کی طرح اپنے متعلق غلط فہمی تھی اور وہ یہ خیال کرتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے فرطِ حیا سے سُرخ ہو جاتی ہے ۔

مگر ایک دفعہ بدنام ہو جانے کے بعد دوبارہ نیک نام ہونا بہت مشکل ہے خواہ انسان کتنا ہی نیک بن جائے اس کا دوبارہ موردِ الزام ہونا بہت سہل ہے ۔ چنانچہ لابلاں شوت کی حزم و احتیاط کے باوجود

بھی لوگوں میں دونوں کے متعلق تذکرے ہونے شروع ہو گئے۔

سائمن کو اپنے نئے آبا سے بہت محبت تھی۔ وہ ہر شام اس کے ساتھ سیر کے لئے جاتا۔ وہ باقاعدہ سکول جاتا۔ اور پورے وقار کے ساتھ سکول کے بچوں سے ملتا اور ان کے سوالات کا جواب نہ دیتا ایک دن اُس لڑکے نے جس نے اس کے سکول آنے کے پہلے دن اس پر حملہ کیا تھا اس سے کہا:

"تم نے جھوٹ بولا ہے۔ فلپ نام کا تمہارا کوئی باپ نہیں ہے"

"تم ایسا کیوں کہتے ہو؟" سائمن نے پریشان ہو کر پوچھا

لڑکے نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا:

"اگر تمہارا کوئی باپ ہوتا تو وہ تمہاری امی کا خاوند ہوتا"

سائمن اس استدلال سے گھبرا گیا اور بولا

"بہر حال وہ میرا باپ ہے"

لڑکے نے طنزیہ انداز میں کہا:

"ایسا ہو سکتا ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تمہارا باپ ہے۔"

لاجواب شوخ لڑکے نے سر جھکا لیا۔ اور مستقبل کے خواب دیکھتا ہوا بوڑھے لوازوں کی بھٹی کی طرف چل پڑا۔ فلپ یہیں کام کرتا تھا۔

یہ بھٹی درختوں کے درمیان بنائی گئی تھی جہاں سخت اندھیرا تھا بھٹی سے نکلتے ہوئے شعلوں کی چمک ہی پانچ لوہاروں کے چہروں پہ روشنی ڈالتی تھی ان کے ہتھوڑوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہ شعلوں سے گھرے ہوئے دیوؤں کی طرح کام میں لگے ہوئے تھے ۔ ان کی نظریں اُس سرخ لوہے پر جمی ہوئی تھیں جسے وہ کوٹ رہے تھے ۔ ان کے خشک خیالات کا اتار چڑھاؤ ہتھوڑے کے اتار چڑھاؤ سے ہم آہنگ تھا۔

سائمن جپکا اندر چلا گیا اور اپنے دوست کو آستین سے پکڑ لیا فلپ نے مڑ کر دیکھا ۔ کام یکایک رک گیا ۔ سب نے ان کی طرف بڑی توجہ سے دیکھنا شروع کیا ۔ اس خلاف معمول خاموشی میں سائمن کی نرم و نازک آواز بلند ہوئی ۔

" مجھے ایک لڑکے نے کہا ہے کہ تم میرے ابا نہیں ہو ۔ مجھے اسکی بات کا مطلب سمجھا دو "

فلپ نے پوچھا " ایسا کیوں ہے ؟ "

لڑکے نے بڑی معصومی سے جواب دیا :

کیونکہ تم میری ماں کے خاوند نہیں ہو "

کسی نے بھی قہقہہ نہیں لگایا ، فلپ اپنے ان بڑے بڑے ہاتھوں کی پشت پہ جبین جھکائے کھڑا رہا جن سے وہ سندان پہ ایستادہ ہتھوڑے

کا دستہ تھامے ہوئے تھا - وہ سوچنے لگا - اس کے چار ساتھی اسے دیکھ رہے تھے - سائمن جوان ججوں کے درمیان بہت چھوٹا سا معلوم ہوتا تھا بڑی تشویش کے ساتھ منتظر تھا - اچانک ایک لوہار سب کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے فلپ سے کہنے لگا:

" لابال شوت ایک اچھی اور نیک لڑکی ہے جو اپنی بدقسمتی کے باوجود مضبوط اور پر استقلال ہے - اور جو ایک دیانتدار آدمی کے لئے عمدہ بیوی ثابت ہو گی "

" یہ درست ہے " تینوں نے بیک زبان کہا

پہلے لوہار نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا :

" کیا یہ اس کا قصور ہے کہ اس نے لغزش کھائی ہے ؟ اس کے ساتھ شادی کا وعدہ کیا گیا تھا اور میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو اسی قدر گنا ہگار رہیں مگر آج لوگ ان کی عزت کرتے ہیں "

" یہ درست ہے " تینوں نے بیک وقت کہا

" پہلا لوہار پھر بولا :

اس نے اپنے بچے کو تعلیم دینے کے لئے کتنی سخت مشقت کی ہے . . . . . اور اس نے کتنے آنسو بہائے ہیں - یہ صرف خدا ہی

جانتا ہے کیونکہ سوائے چرچ کے وہ اور کہیں نہیں جاتی۔"

"یہ بھی درست ہے" دوسروں نے کہا۔

اس کے بعد اُن پھونکنیوں کی آواز کے سوا کچھ نہ سنائی دیا جو آگ بھڑکا رہی تھیں۔ فلپ جلدی سے سائمن کے اوپر جھکا اور کہا:

"جاؤ اپنی ماں سے کہو کہ میں اس سے کچھ کہنے کے لئے آؤں گا"

اس نے بچے کو شانے سے پکڑ کر باہر بھیج دیا اور کام کی طرف متوجہ ہوا۔ پانچوں نے مل کر لوہا کوٹنا شروع کیا۔ وہ آمدِ شب تک کام کرتے رہے وہ دیوتا کی طرح مضبوط، خوش اور مطمئن تھے۔ مگر فلپ کے ہتھوڑے کی آواز دوسروں کے ہتھوڑوں کی آواز پر چھائی ہوئی تھی جیسے کہ بڑے گرجا گھر کی گھنٹی کی آواز دوسری گھنٹیوں کی آوازوں پر غالب آجاتی ہے۔

اس کی نگاہیں آگ پر تھیں۔ وہ شعلوں کے درمیان سیدھا کھڑا اپنا کام پوری قوت کے ساتھ کر رہا تھا۔

جب اس نے لابلاں شوٹ کے دروازے پر دستک دی تو آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے اپنا سنڈے سوٹ پہنا ہوا تھا اور اسکی قمیض بالکل نئی اور اسکی داڑھی کتری ہوئی تھی۔

نوجوان عورت دروازے پر آئی اور درد بھرے لہجے میں بولی :

"رات گئے آنا اچھی بات نہیں، فلپ"

وہ جواب دینا چاہتا تھا مگر ہکلا کر چپکا پریشان کھڑا رہ گیا

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی :

"یہ اچھی بات نہیں ہے کہ لوگ میرے متعلق باتیں کرنے لگیں"

اُس نے فوراً جواب دیا : " اگر تم میری بیوی بن جاؤ تو مجھے اسکی . . . . لوگوں کی باتوں کی . . . . کسی کی بھی . . . متعلق پرواہ نہیں ہے "

اُسے کوئی جواب نہ ملا - مگر اس نے کمرے کی تاریکی میں کسی کے گرنے کی آواز سنی - وہ تیزی سے اندر داخل ہوا۔ سائمن نے اپنے بستر پر بوسہ کی آواز اور وہ چند الفاظ سنے جو اسکی ماں نے بڑی نرمی سے کہے تھے - پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کے دوست نے اُسے اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھایا ہے جو یہ کہہ رہا تھا :

" تم اپنے سکول کے لڑکوں کو بتا دو کہ فلپ رامے لوہار تمہارا ابا ہے - وہ تمہیں تنگ کرنے والوں کے کان کھینچے گا "

اگلی صبح جب سکول لڑکوں سے پر ہو گیا اور ابھی سبق شروع

ہی ہونے والا تھا کہ ننھّا سائمن اٹھ کھڑا ہوا اس کا رنگ زرد تھا اور ہونٹ
کانپ رہے تھے ۔ اُس نے واضح الفاظ میں کہا

" فلپ رامے لوہار میرا آبا ہے ۔ اگر کوئی لڑکا مجھے گزند
پنہچائے گا تو وہ اس کے کانوں پہ مکّے رسید کرے گا ۔ اس دفعہ کوئی
بھی نہ ہنسا ۔ کیونکہ فلپ رامے لوہار کو لوگ اچھی طرح جانتے تھے وہ
ایک ایسا باپ تھا جس پہ دنیا کا ہر فردِ بشر فخر کر سکتا تھا۔

مُبارزت

جنگ، ختم ہو چکی تھی ۔ جرمنوں نے فرانس پر قبضہ کر لیا تھا تمام ملک اس پہلوان کی طرح ہانپ رہا تھا جسے اس کے کامیاب حریف نے اپنے زانو تلے دبا رکھا ہو۔

پیرس میں قحط، مصیبت اور مایوسی کا غلبہ تھا، یہاں سے نئی سرحد کو جانے والی گاڑیاں قصبوں اور دیہاتوں سے آہستہ آہستہ گذر رہی تھیں۔ اور مسافر کھڑکیوں میں سے تباہ شدہ کھیت اور جلے ہوئے گاؤں

دیکھ رہے تھے۔ پرشا (صوبہ جرمنی) کے فوجی سیاہ اور نوکیلی خودیں پہنے نیچے کھچے مکانوں کے دروازوں کے سامنے گھوڑوں پر سوار اور کرسیوں پر ایستادہ پائپ پی رہے تھے۔ دوسرے کچھ انداز سے گفتگو اور کام کاج میں مصروف تھے کہ اُن پر اہل خانہ ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ مختلف قصبوں کے چوراہوں میں فوجی دستے پریڈ کرتے ہوئے نظر آتے تھے اور گاڑی کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ کے باوجود کمانڈ کے کرخت الفاظ سنائی دیتے تھے۔

موسیو دوبوی نے محاصرہ کے دوران پیرس میں نیشنل گارڈ کے طور پر کام کیا تھا اُس نے حملہ سے قبل اپنی بیوی اور بیٹی کو سوئٹزرلینڈ بھیج کر بڑی دانائی کی تھی اور اب خود وہ اُن کے پاس جا رہا تھا۔ قحط اور تھکن سے بھی اس صلح پسند اور دولتمند تاجر کی توند میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ اُس نے خوفناک واقعات کا تاسف آمیز صبر سے مقابلہ کیا تھا اور وہ انسانوں کی درندگی کا شاکی تھا۔ اُس نے سرحد کی طرف سفر کرتے ہوئے پہلی بار پرشین (جرمن) سپاہیوں کو دیکھا تھا حالانکہ وہ فصیل کے اوپر ڈیوٹی دے چکا تھا اور سرد راتوں میں پہرہ داری کے فرائض انجام دیتا رہا تھا۔

وہ خوف اور غصہ کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اُن باریش

مسلح آدمیوں کو گھور رہا تھا جو تمام فرانس پر اس طرح سے پھیلے ہوئے جیسے کہ وہ اپنے ہی گھروں میں ہوں۔ وہ تحفظ نفس اور احتیاط کے جذبوں کے ساتھ (جو کبھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتے) ایک ناکردہ کار حب الوطنی کی حرارت بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ اسی ڈبہ میں دو انگریز تماشائیوں کی حیثیت سے سفر کر رہے تھے اور گرد و پیش اپنی متجسس نگاہیں دوڑا رہے تھے۔ وہ دونوں مضبوط تھے اور اپنی زبان میں باتیں کرتے جاتے تھے۔ اپنی گائیڈ بک کا مطالعہ بھی کرتے جاتے تھے اور مقامات کے نام باواز بلند پڑھتے جاتے تھے

دفعۃً گاڑی ایک دیہات کے سٹیشن پر رکی اور ایک پرشین (جرمن) افسر تلوار لئے ڈبے کے فٹ بورڈ پر چڑھ آیا اس کا قد لمبا، وردی تنگ اور داڑھی بے ہنگم تھی۔ اس کے سُرخ بال شعلہ معلوم ہوتے تھے۔ اس کی نسبتاً کم سُرخ مونچھیں چہرے کے دونوں طرف پھیلتی ہوئی اسے دو حصوں میں تقسیم کرتی تھیں۔ انگریزوں نے مسکراتے ہوئے اسے بڑی دلچسپی سے دیکھنا شروع کر دیا۔ مگر موسیو دوبوی اخبار بینی کا اظہار کرتا رہا تھا۔ وہ کونے میں اس طرح دبک کر بیٹھ گیا جس طرح چور پولیس کے سپاہی کی موجودگی میں بیٹھتا ہے۔

گاڑی دوبارہ روانہ ہوئی۔ انگریز مسافر آپس میں باتیں

کرتے جاتے تھے اور ان مقامات کو دیکھتے جاتے تھے جو میدان جنگ بن چکے تھے۔ اچانک ایک نے دور افق کی طرف ایک گاؤں کی طرف اشارہ کیا۔

اس پر پرشین افسر نے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے اور ٹیک لگاتے ہوئے، فرانسیسی زبان میں کہا "ہم نے اس گاؤں میں ایک درجن فرانسیسیوں کو قتل کر دیا اور ایک سو سے زیادہ کو قیدی بنایا"۔

انگریزوں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے فوراً پوچھا "اس گاؤں کا نام کیا ہے؟"

پرشین نے جواب دیا "فارسس برگ، ہم نے تین فرانسیسی محافظوں کو کان سے پکڑا"، اور اس نے ہنستے ہوئے حقارت سے موسیو دو لیوی کی طرف دیکھا۔

گاڑی مقبوضہ قصبوں کے درمیان سے گذرتی رہی۔ سڑکوں کھیت کے کناروں، دروازوں کے سامنے اور قہوہ خانوں کے باہر ہر طرف جرمن سپاہی نظر آتے تھے۔ وہ افریقہ کی ٹڈی دل بن کر چھائے ہوئے تھے افسر نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا:

"اگر میرا حکم چلتا تو میں پیرس پر قبضہ کر کے ہر چیز کو جلا دیتا اور ہر ایک کو قتل کر دیتا۔ اور فرانس کا خاتمہ ہو جاتا"۔

انگریزوں نے شائستگی ملحوظ رکھتے ہوئے صرف ہاں میں جواب

دیا اُس نے کہنا شروع کیا " بیس سال میں ہم پورے یورپ پر قابض ہو جائیں گے - پرشا سب کا حریف ہو سکتا ہے "

انگریز بیزار ہوئے اور اس بات کا کچھ جواب نہیں دیا - اُن کے مونچھوں سے ہمکنار سنجیدہ چہرے یوں معلوم ہونے لگے گویا کہ موم سے بنے ہوں " اس پر پرشین افسر نے ہنسنا شروع کیا - پھر ٹیک لگاتے ہوئے ٹھٹھا شروع کیا - اُس نے فرانس کی شکست کا مذاق اڑا کر ہزیمت خوردہ دشمن کی توہین کی - اُس نے نو مفتوحہ آسٹریا کی تضحیک کی - اُس نے ... شدید مگر ناکردہ کار دفاع کی ہنسی اڑائی - اُس نے توپ خانے اور محافظ دستے پر پھبتی کسی - اُس نے اعلان کیا کہ بسمارک مقبوضہ توپوں کو ڈھال کر آہنی شہر آباد کرنے والا ہے - اچانک اُس نے موسیو دوبوی کی ران کو اپنے بوٹوں سے دبایا - موسیو دوبوی سر سے پاؤں تک سرخ ہو گیا اور اپنی نظریں دوسری طرف پھیریں - انگریزوں نے بے تعلقی کا اظہار کیا گویا وہ دنیا کے شور و شغب سے دور اپنے جزیرہ میں دوبارہ بند کر دیئے گئے ہوں - افسر نے اپنا پائپ نکالا اور فرانسیسی مسافر کو گھور کر دیکھا اور کہا " کیا تمہارے پاس کوئی تمباکو ہے ؟ "

موسیو دوبوی نے جواب دیا ۔ " نہیں جناب "

اس پر جرمن افسر نے کہا " جب ٹرین رک جائے تو تم جا کر کہیں سے

میرے لئے ضرور تمبا کو لے آنا۔ میں تمہیں ٹپ کر دوں گا،، گاڑی نے سیٹی دی اور اس کی رفتار سست پڑ گئی۔ وہ ایک آتش زدہ سٹیشن پر پہنچ گئے۔ یہاں ٹرین کو ٹھہرنا تھا۔ جرمن نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور موسیو دوبوی کو بازو سے پکڑ کر کہا " جاؤ، اور جو کچھ میں نے تمہیں کرنے کو کہا ہے کرو۔ ذرا جلدی کرنا"

سٹیشن پر جرمن دستے کا قبضہ تھا۔ دوسرے سپاہی جنگلے کے پیچھے سے دیکھ رہے تھے۔ انجن دوبارہ چلنے کے لئے بھاپ نکال رہا تھا۔ موسیو جلدی سے پلیٹ فارم پر اترا اور سٹیشن ماسٹر کے انتباہ کے باوجود ساتھ کے ڈبے میں جا گھسا۔

اُس نے تنہائی میں اپنی واسکٹ اتاری۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ہانپتے ہوئے اس نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا گاڑی ایک اور سٹیشن پر کھڑی ہوئی۔ یکایک وہی افسر نمودار ہوا اور ڈبے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ دو انگریز بھی اس کے پیچھے متجسسانہ انداز میں اندر آ گئے۔ جرمن فرانسیسی کے بالمقابل بیٹھ گیا اور ہنس کر پوچھا " تم میرا حکم بجالانا نہیں چاہتے ؟ "

موسیو دوبوی نے کہا " نہیں۔ جناب "

ٹرین چل پڑی۔ جرمن افسر نے کہا " میں تمہاری مونچھیں کاٹ کر اپنا پائپ بھر دوں گا،، یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ فرانسیسی کے

چہرے کی طرف بڑھایا۔

انگریز بے تعلقی سے ٹکٹکی باندھے دیکھے جارہے تھے۔ جرمن نے مونچھیں پکڑلی تھیں اور انہیں کھینچ رہا تھا۔ موسیو دوبوی نے اپنے ہاتھ سے اس کا بازو جھٹک دیا۔ اور اُس کو کالر سے پکڑ کر سیٹ پر گرا لیا۔ موسیو دوبوی غصہ سے دیوانہ ہورہا تھا۔ اس کی کنپٹیاں پھولی ہوئی تھیں اور اسکی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے اس کا گلا گھونٹتا جارہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے منہ پر زور زور کے مُکّے لگا رہا تھا۔ جرمن اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے لیٹے لیٹے تلوار سونتنے کی کوشش بھی کی اور اپنے دشمن کو قابو کرنا بھی چاہا۔ لیکن موسیو دوبوی نے اُسے اپنی موٹی توند کے بوجھ کے تلے پیس کر رکھدیا تھا اور برابر اُسے مارے جارہا تھا۔ بغیر سانس لئے اور بغیر یہ سوچتے ہوئے کہ اس کے مکّے کہاں لگ رہے ہیں۔

جرمن کا چہرہ خون آلود تھا، اور دم گھٹ رہا تھا اُس نے اپنے ٹوٹے ہوئے دانت تھوک پھینکے اور اس غضبناک آدمی کو جو اُسے قتل رہا تھا پھینکنے کی کوشش کی۔ مگر بے سُود۔

انگریز کھڑے ہو گئے اور قریب آ گئے تا کہ بہتر طریق پر دیکھ سکیں وہ بہت خوش اور متجسس تھے۔ اور یہ شرط لگانے کو

تیار تھے کہ دونوں میں سے کون جیتے گا۔

دفعتہً موسیو دوبوی اٹھا اور اپنی سیٹ پر چپکا جا بیٹھا وہ اس سعی بیہم سے تھک چکا تھا۔ جرمن نے اس پر حملہ نہیں کیا۔ کیونکہ وہ خوف زدہ ہو چکا تھا۔ جب وہ سستا چکا تو کہنے لگا "اگر تم پستول کے ساتھ میرا مقابلہ کر کے مطمئن نہ کر دو گے۔ تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔"

موسیو دوبوی نے جواب دیا "جب بھی تم چاہو۔ میں اس کے لئے تیار ہوں"

جرمن نے کہا "وہ سٹرس برگ کا سٹیشن قریب رہا ہے۔ میں دو افسروں کو بطور معاون لوں گا۔ گاڑی کی روانگی تک ہمارے پاس کافی وقت ہو گا موسیو دوبوی نے انجن کی طرح ہانپتے ہوئے دو انگریزوں سے کہا "کیا آپ لوگ میرے معاون بن سکتے ہیں۔" دونوں نے بیک وقت جواب دیا۔ "جی ہاں"

گاڑی رک گئی۔ جرمن افسر ایک منٹ میں دو ساتھیوں کو لے آیا جنہوں نے پستول تھام رکھے تھے۔ سب نے فصیل کی طرف چلنا شروع کیا۔ انگریز برابر اپنی گھڑی دیکھتے جاتے تھے اور جلدی جلدی قدم اٹھا رہے تھے۔ اور گاڑی چھوٹ جانے کے ڈر سے عجلت

سے مقابلے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

موسیو دوبوی نے عمر بھر میں کبھی پستول نہیں چلایا تھا۔ اسے اس کے دشمن سے بیس قدم کے فاصلے پر کھڑا کیا گیا اور پوچھا گیا۔

"کیا تم تیار ہو؟" جب وہ ہاں جناب کہہ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ انگریز چھتری کھول کر سورج کی شعاعوں کو خارج ہونے سے روک رہا تھا آواز آئی "گولی چلا دو!"

موسیو دوبوی نے بغیر سوچے سمجھے گولی چلا دی۔ اُسے جرمن افسر کو اپنے سامنے لڑکھڑاتے، بازو اٹھاتے اور منہ کے بل زمین پر گرتے ہوئے دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ اُس نے اپنے دشمن کو قتل کر دیا تھا۔

اُن دو انگریزوں میں سے ایک خوشی سے اچھل پڑا، اس کے جذبہ تجسس کی تسکین ہو چکی تھی۔ وہ مسرت سے بے قابو ہو رہا تھا۔

دوسرا انگریز جو تمام وقت گھڑی تھامے رہا تھا موسیو دوبوی کو بازو سے پکڑے سٹیشن کی طرف بھاگنے لگا، اُس کا ہموطن دونوں کے قدم گن رہا تھا "ایک دو، ایک دو" تینوں کسی اخبار کے کارٹون کی طرح حلیہ بنائے سٹیشن کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔

گاڑی چھوٹنے ہی والی تھی۔ وہ جلدی سے ڈبے میں داخل ہوئے۔

انگریزوں نے اپنی ٹوپیاں اتاریں اور انہیں تین بار اپنے سروں کے اوپر لہرا کر "ہپ ہپ ھُرّا" کہا۔ اس کے بعد انہوں نے یکے بعد دیگرے بڑی سنجیدگی کے ساتھ موسیو دو لوری سے ہاتھ ملایا اور اپنی نشستوں پر جا بیٹھے۔

نقلی جواہرات

مسیو لانطین اس نوجوان عورت سے ایک عشائیہ پر متعارف ہوا تھا اس کے دفتر کے اسسٹنٹ چیف نے یہ پارٹی دی تھی۔ وہ پہلی ہی نظر میں دیوانہ وار اس پر فریفتہ ہوگیا۔

وہ ایک دیہاتی طبیب کی لڑکی تھی جو چند ماہ قبل مرچکا تھا وہ اپنی ماں کے ساتھ پیرس میں رہنے لگی تھی۔ اس کی ماں اپنے مختنا ساؤں سے بہت

میل جول رکھتی تھی اس اُمید پر کہ اسکی بیٹی کو کوئی مناسب بر مل جائے گا - وہ غریب مگر دیانتدار لوگ تھے جو تصنع سے پاک اور خانوش طبع تھے۔

نوجوان لڑکی باعصمت صنف نازک کا ایسا کامل نمونہ تھی - جسکو بیوی بنانے کا خواب ہر سمجھدار آدمی دیکھتا ہے - اس کے حسنِ سادہ میں فرشتوں کی سی معصومیت تھی - اور اس کے لبوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ ایک غیر ملوث اور قابل محبت روح کی آئینہ دار تھی - سبھی اس کے مداح سرا تھے اور ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ وہ آدمی انتہائی طور پر خوش قسمت ہو گا - جسے وہ اپنی محبت سے نوازے گی - اس سے بہتر بیوی ملنا محال ہے۔

موسیو لانطین کی آمدنی سات سو فرانک تھی - اور وہ سمجھتا تھا کہ وہ ازدواجی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھا سکتا ہے - چنانچہ اس نے اس مثالی لڑکی سے شادی کی التجا کی جو قبول کر لی گئی۔

وہ اس کے ساتھ نہایت ہی خوشی کی زندگی بسر کرنے لگا وہ اس کے گھر کا نظام ایسی خوبصورتی اور کفایت سے چلاتی کہ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ عیش و عشرت کی زندگی گذار رہے ہیں۔ وہ اپنے خاوند کا بیحد خیال رکھتی تھی - اس سے لگاوٹ اور دل لگی میں کمی نہ آنے دیتی تھی۔ اس کے وجود میں اس قدر جاذبیت تھی کہ چھ سال گذرنے کے بعد بھی موسیو نطین کو یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ اسے ہنی مون کے اوائل ایام سے

بھی زیادہ چاہتا ہے۔

اُسے اپنی بیوی سے صرف دو شکائتیں تھی۔ ایک یہ کہ وہ تھیئٹر بہت دیکھتی تھی اور دوسرے یہ کہ وہ نقلی جواہرات کا ذوق رکھتی تھی۔ اس کی سہیلیاں جو کہ افسروں کی بیویاں تھیں اس کے لئے تھیئٹر میں بوکس مہیا کر دیتی تھیں، اس وقت جبکہ کوئی نیا کھیل ہونے والا ہو۔ اور اس کے خاوند کو مجبوراً اس کا ساتھ دینا پڑتا تھا۔ خواہ اسے یہ تفریحات پسند ہوں یا ناپسند۔ اور یہ تفریحات اُسے دن بھر دفتر میں کام کرنے کے بعد انتہائی طور پر بار گذرتی تھیں۔

کچھ عرصہ کے بعد اس نے اپنی بیوی سے درخواست کی کہ وہ اپنی کسی شناسا کو اپنے ساتھ لے جایا کرے۔ پہلے تو اسکی بیوی نے اس بات کی مخالفت کی۔ مگر خاوند کے اصرار اور ترغیب پر وہ رضامند ہو گئی اور بیچارے لانطین کو اطمینان نصیب ہوا۔

تھیئٹر کے شوق کے ساتھ ہی اب اُسے اپنے آپ کو آراستہ کرنے کی خواہش ہوتی۔ اس کا لباس تو پہلے کی طرح سادہ ہی رہا مگر اس نے اپنے کانوں میں حقیقی ہیروں سے ملتے جلتے جواہرات پہننے شروع کر دیئے گردن میں نقلی موتیوں کا ہار اور بازو پر نقلی سونے کا بازو بند آویزاں کرنے لگی۔

اس کا خاوند اسے ناصحانہ انداز میں کہتا "میری پیاری، چونکہ تم کو اصلی ہیرے میسر نہیں آ سکتے - اس لئے تمہیں اپنی عصمت اور اپنے حسن سے تزئین کرنی چاہیے - یہی صنف نازک کے لئے نایاب ترین زیورات ہیں - مگر وہ مسکرا کر کہتی " میں کیا کر سکتی ہوں - مجھے زیورات کا بیحد شوق ہے - مجھ میں صرف یہی ایک تو کمزوری ہے - انسان اپنی فطرت کو کیسے بدل سکتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ موتیوں کا ہار اپنی انگلیوں پر لپیٹ لیتی اور چمکدار ہیرے اپنے خاوند کو دکھلاتی تاکہ وہ انہیں سراہے اور پیار بھرے انداز میں کہتی:
" دیکھو تو سہی ! کتنے پیارے ہیں یہ - اُن کے اصلی ہونے کی قسم کھائی جا سکتی ہے - "

موسیو لنطین مسکرا کر جواب دیتا " میری پیاری، تمہارا ذوق بُرا بھی ہے - " شام کے وقت جب وہ آگ کے قریب بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے ہمکلامی کا لطف اٹھا رہے ہوتے تو وہ جواہرات کا ڈبہ چائے کی میز پر رکھ دیتی - موسیو ان جواہرات کو فضولیات کہا کرتا تھا - وہ ان نقلی جواہرات کو توجہ اور محویت سے دیکھتی تھی گویا ان کا کسی مخفی اور گہری خوشی کے ساتھ کوئی رابطہ تھا - اکثر وہ ازرہِ تفنّن کوئی ہار لیکر اپنے خاوند کی گردن میں ڈالنے پر مصر ہو جاتی اور زور زور سے ہنستی ہوئی کہتی: تم یہ پہن کر کیسے عجیب معلوم ہوتے ہو " پھر اس سے بغلگیر ہو جاتی اور اُسے

بوسہ دیتی تھی۔

موسم سرما کی ایک شام کو اُس نے اوپرا دیکھا۔ واپسی میں اُسے سردی لگ گئی۔ اگلی صبح کو وہ شدید کھانسی میں مبتلا ہوئی اور آٹھ دن کے بعد وہ پھیپھڑوں کی سوزش کے مرض کا شکار ہو کر لقمۂ اجل ہو گئی۔

موسیو لانٹین غم کی وجہ سے بے حال ہو گیا۔ ایک ماہ میں اس کے تمام بال سفید ہو گئے۔ وہ پیہم زار و قطار روتا رہا۔ اس کے دل و دماغ میں اسکی بیوی کی یادیں بس گئیں۔ اس کے ذہن میں اپنی مردہ بیوی کی آواز اس کا تبسم اور اسکی دلکشیاں اور رعنائیاں گردش کرنے لگیں۔

زخموں کو بھرنے والا وقت بھی اس کے غم کو کم نہ کر سکا دفتر میں بھی جب کہ اس کے ساتھی حالاتِ حاضرہ پر گفتگو میں مصروف ہوتے تو یکایک اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور وہ غم سے سسکیاں بھرنے لگتا۔ اسکی بیوی کے کمرے کی ہر چیز اسی طرح قرینے سے پڑی رہی جیسے کہ وہ اس کے مرنے سے پہلے تھی۔ یہاں وہ ہر روز خلوت گزیں ہوتا اور اپنی محبوبہ کے متعلق سوچتا جو اس کا بے بہا خزانہ اور اس کی زندگی کی مسرت تھی۔

لیکن بہت جلد ہی اُسے زندگی کی مشکلات سے دو چار ہونا پڑا اس کی وہ آمدنی جس سے کہ اس کی بیوی گھر کے تمام اخراجات پورے کرتی تھی اب اس کی معمولی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بھی ناکافی تھی

اب اس کو حیرت ہوتی تھی کہ اسکی بیوی اتنی شاندار شرابیں کیسے خریدتی تھی اور ایسی عمدہ اور نایاب اشیا کہاں سے لاتی تھی وہ اشیاء جنہیں وہ اپنی معمولی آمدنی سے کبھی بھی فراہم نہ کر سکتا تھا۔

اس نے قرض لینا شروع کیا اور جلد ہی مفلس و نادار ہو گیا ایک صبح جبکہ اسکی جیب میں کچھ بھی نہ تھا اس نے گھر کی کوئی چیز بیچ دینے کا ارادہ کیا۔ یکایک اُسے اپنی بیوی کے نقلی جواہرات کا خیال آیا۔ اسے ان جواہرات پر سخت طیش آیا کرتا تھا۔ ان کا نظارہ اسکی بیوی کی حسین یادوں کی دلکشی کو کم کرتا تھا۔

اپنی زندگی کے آخری ایام تک اس کی بیوی نے جواہرات کی خرید جاری رکھی تھی اور ہر شام وہ نئے جواہرات خرید لاتی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہی ہار فروخت کیا جائے جو اسکی بیوی کو بہت پسند تھا اس کا خیال تھا کہ یہ ہار چھ یا سات فرانک میں بک جائے گا۔ کیونکہ نقلی ہونے کے باوجود یہ بڑی کاریگری سے بنایا گیا تھا

اس نے اسے جیب میں ڈالا اور کسی جوہری کی دکان کی تلاش میں نکلا جو دکان سب سے پہلے اُسے نظر آئی اُسی میں داخل ہو گیا۔ اُسے اپنی غربت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور اس خیال سے کہ وہ ایسی بے حقیقت چیز فروخت کرنے آیا ہے شرم محسوس ہو رہی تھی

"جناب والا! میں اس ہار کی قیمت معلوم کرنا چاہتا ہوں" اس نے تاجر سے پوچھا۔

دکاندار نے ہار کو غور سے دیکھا۔ اپنے کلرک کو آواز دی اور آہستہ سے کچھ کہا۔ پھر اُس نے اسے میز پر رکھ کر دور سے دیکھنا شروع کیا۔

موسیو لانطین اس طویل معائنہ سے بیزار ہو گیا اور وہ یہ کہنے ہی لگا تھا کہ جناب میں جانتا ہوں کہ بالکل ہی کم قیمت چیز ہے جبکہ جوہری نے یہ کہا "جناب اس کی قیمت بارہ اور پندرہ ہزار فرانک کے درمیان ہے۔ مگر جب تک آپ یہ نہ بتائیں کہ یہ آپ کے ہاتھ کیسے لگا میں اسے خرید نہیں سکتا۔"

موسیو لانطین نے بڑی حیرت سے دکاندار کی طرف دیکھا۔ وہ اسکی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا۔ آخر کار اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا "کیا آپ کو یقین ہے کہ واقعی اسکی یہی قیمت ہے دکاندار نے بے تعلقی سے جواب دیا "آپ بڑے شوق سے کسی اور سے بھی دریافت کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اسکی زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار فرانک قیمت ہو سکتی ہے۔ اگر آپ کو اس سے زیادہ نہ مل سکیں تو ہمارے پاس واپس آجائیے گا۔"

موسیو لانطین کی حیرت کی انتہا نہ رہی - اس نے ہار واپس لیا اور باہر نکل آیا - اُسے غور کرنے کے لیے وقت درکار تھا -

باہر آکر اُسے ہنسی آئی اور اپنے دل میں کہنے لگا " یہ بھی نرا احمق تھا - اگر میں اس کے قول کا اعتبار کر لیتا تو اسے پتہ چل جاتا اسے تو نقلی اور اصلی میں تمیز تک نہیں ہے "

چند لمحے بعد وہ ایک اور دکان میں داخل ہوا - جونہی دکاندار نے ہار دیکھا اُس کے منہ سے بے ساختہ یہ نکلا " آہا - یار بلو میں اسے خوب پہچانتا ہوں - یہ ہمارے ہاں سے ہی خریدا گیا تھا "

موسیو لانطین نے پریشان ہو کر پوچھا " اسکی قیمت کیا ہے ؟ "

" میں نے اسے بیس ہزار فرانک میں فروخت کیا تھا - میں اسے اٹھارہ ہزار میں خرید لوں گا اگر آپ مجھے یہ بتا سکیں گے کہ یہ آپ کی ملکیت میں کیوں کر آیا - "

اب تو موسیو لانطین بھونچکا ہو کر رہ گیا اور اس نے دکاندار سے کہا " اسے اچھی طرح سے پرکھ لو - میں تو اسے نقلی سمجھ رہا تھا "

جوہری نے پوچھا " جناب آپ کا نام کیا ہے - "

" لانطین " اس نے جواب دیا " میں وزارت داخلہ میں ملازم ہوں - میں 16 مارٹر سٹریٹ میں رہتا ہوں "

دکاندار نے اپنی کتابوں کے اندراجات کو دیکھا اور کہا "یہ ہار مادام لانطین کو ۱۶ مارٹرز سٹریٹ کے پتہ پر بیس جولائی 1876ء میں بھیجا گیا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگے۔ لانطین حیرت سے خاموش تھا اور دکاندار کو اس کے چور ہونے کا پتہ تھا۔ آخر کار موخر الذکر نے یہ کہہ کر مہر سکوت توڑی
"کیا آپ یہ ہار چوبیس گھنٹوں کے لئے ہمارے پاس چھوڑ سکتے ہیں؟ - میں آپ کو رسید لکھ دیتا ہوں
"ضرور" موسیو لانطین نے جواب دیا اور رسید لے کر چل پڑا وہ منہ اٹھائے بازاروں میں ادھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ یقیناً اتنا قیمتی ہار نہیں خرید سکتا تھا۔ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ یہ تحفہ تھا مگر یہ تحفہ اُسے کس نے دیا؟ اور کیوں دیا؟

وہ بازار کے عین درمیان رُکا کھڑا رہا۔ ایک بھیانک شک اس کے دل میں پیدا ہوا۔ وہ ایسی تھی؟ باقی جواہرات بھی ضرور اس نے بطور تحفہ ہی حاصل کئے ہونگے۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُسے اپنے سامنے کا درخت گرتا ہوا معلوم ہوا۔ وہ بے ہوش ہو

کر گر پڑا - اُسے ایک دواخانے میں ہوش آیا جہاں اسے لوگ اٹھا کر لے گئے تھے - گھر واپس آکر وہ اپنے کمرے میں بند ہو کر رات پڑنے تک روتا رہا - آخر تھک کر بستر پر لیٹ گیا اور بے قراری میں رات گذاری

صبح اٹھ کر وہ دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا - اس صدمہ کے بعد کام کرنا سخت مشکل تھا - اس نے چھٹی کی درخواست بھیج دی - پھر اُسے یاد آیا کہ اسے جوہری کے پاس بھی جانا ہے - اگرچہ اُسے وہاں جانا ناپسند تھا مگر وہ ہار جوہری کے پاس رکھنا پسند نہیں کرتا تھا اس نے لباس تبدیل کیا اور چل پڑا -

دن حسین تھا - نیلگوں آسمان مصروف شہر پہ اپنی مسکراہٹ بکھیر رہا تھا بے فکرے لوگ اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چہل قدمی کر رہے تھے انہیں دیکھ کر موسیو لانطین نے دل میں کہا " دولتمند لوگ یقیناً خوش ہوتے ہیں - دولت پا کر انسان بڑے سے بڑا غم فراموش کر سکتا ہے آدمی جہاں چاہے جا سکتا ہے اور سفر کی دلچسپیوں میں کھو کر اپنے غم کا مداوا کر سکتا ہے - کاش میں بھی دولتمند ہوتا !

اُسے بھوک لگ رہی تھی مگر اس کی جیب خالی تھی - اُسے پھر ہار کا خیال آیا - اٹھارہ ہزار فرانک ! کتنی بڑی رقم ہے !

جلد ہی وہ جوہری کی دکان کے سامنے پہنچ گیا - اٹھارہ ہزار

فرانک بیس دفعہ اس نے اندر جانے کا ارادہ کیا مگر شرم مانع آئی - وہ بھوکا تھا۔ بہت بھوکا۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کی جیب میں کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے تیزی سے فیصلہ کیا اور جلدی سے بھاگ کر دکان کے اندر داخل ہو گیا تاکہ اسے زیادہ سوچنے کا وقت ہی نہ ملے

مالک فوراً آگے بڑھا اور اسے کرسی پیش کی۔ کلرک نے رازدارانہ انداز میں اسکو دیکھا۔

جوہری نے کہا "موسیو لانطین! میں نے اپنی تحقیقات مکمل کر لی ہیں اور اگر آپ اسے بیچنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو یہ اٹھارہ ہزار فرانک دے سکتا ہوں"

"یقیناً جناب" موسیو لانطین نے ہکلاتے ہوئے کہا

اس پر دکاندار نے اٹھارہ نوٹ موسیو لانطین کو دیئے موسیو نے رسید لکھ دی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رقم اپنی جیب میں ڈال لی۔

جب وہ دکان سے باہر آنے ہی والا تھا اس نے دکاندار کی معنی خیز مسکراہٹ کو دیکھا اور اس سے کہا "میرے پاس کچھ اور جواہرات ہیں جو مجھے اسی طرح ملے ہیں جس طرح یہ ہار ملا تھا۔ کیا آپ انہیں خرید لیں گے؟

جوہری نے جھک کر کہا "یقیناً جناب"

موسیو لانطین نے سنجیدگی سے کہا" میں انہیں آپ کے پاس لے آؤں گا"
ایک گھنٹہ کے بعد وہ جواہرات لے کر آ گیا۔

ہیرے کے بڑے بڑے آویزاں کی قیمت بیس ہزار فرانک تھی۔
بریسلیٹ پینتیس ہزار فرانک کے تھے۔ انگشتریاں سولہ ہزار فرانک زمرد کا سیٹ چودہ ہزار فرانک۔ سونے کی زنجیر جس میں ہیرے آویزاں تھے، چالیس ہزار فرانک ــــــ کل رقم ایک لاکھ پینتالیس ہزار فرانک ہوئی۔

جوہری نے ازرہِ مذاق کہا" اس عورت نے اپنی تمام کمائی جواہرات پر صرف کر دی تھی"

موسیو لانطین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔" یہ بھی سرمایہ لگانے کا ایک طریقہ ہے" اُس دن اس نے بہترین ہوٹل میں کھانا کھایا اور بیس فرانک فی بوتل کے حساب سے شراب پی۔ پھر اس نے کرایہ پر گاڑی لے کر مضافات کی سیر کی وہ امرا کو دیکھ کر چیخ اٹھتا تھا اور کہتا تھا" میں بھی دولتمند ہوں! میرے پاس دو لاکھ فرانک ہیں۔

اچانک اُسے اپنے مالک کا خیال آیا۔ وہ گاڑی کو دفتر میں لے گیا اور بڑی خوشی سے دفتر کے اندر داخل ہوا اور کہا" جناب میں استعفےٰ دینے آیا ہوں۔ مجھے ابھی ابھی وراثت میں تین لاکھ فرانک ملے ہیں۔

اس نے اپنے پرانے رفقائے کار سے مصافحہ کیا اور کچھ دوستوں کو اپنے مستقبل کے منصوبوں سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد وہ کیفے اینگلے کے شاندار ہوٹل میں ڈنر کھانے کے لئے چلا گیا۔

وہ ایک متمول رئیس کے قریب بیٹھا اور کھانے کے دوران میں اُسے بتلایا کہ اُسے چار لاکھ فرانک کا ورثہ ملا ہے۔

وہ تھیئٹر میں گیا اور زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ یہاں پر بور نہ ہوا اور اس نے تمام رات خوش فعلیوں میں بسر کر دی

چھ ماہ کے بعد اس نے شادی کر لی۔ اس کی دوسری بیوی باعصمت مگر بدمزاج عورت تھی اور وہ اُسے بہت اذیت پہنچاتی تھی۔

انوکھی محبت

مارکوئیس آف بہ تراں کے ہاں موسم شکار کا افتتاحی ڈنر ختم ہو چکا تھا۔ پھلوں اور پھولوں سے آراستہ روشن میز کے گرد گیارہ شکاری، آٹھ عورتیں اور ایک ڈاکٹر بیٹھے ہوئے تھے

وہ محبت کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ وہی ابدی گفتگو!

کیا سچی محبت زندگی میں صرف ایک ہی دفعہ کی جا سکتی ہے یا ایک سچی محبت زندگی میں صرف ایک ہی دفعہ کی جا سکتی ہے یا ایک سے زیادہ دفعہ؟ ایسے آدمیوں کی

مثالیں دی گئیں جنہوں نے زندگی میں صرف ایک ہی بار سنجیدگی سے محبت کی اور ان آدمیوں کا بھی تذکرہ ہوا جنہوں نے بارہا بڑی شدت سے محبت کی۔ مردوں کا خیال تھا یہ شدید جذبہ ایک مرض کی طرح ایک ہی شخص کو بارہا لاحق ہو سکتا ہے اور جو بھی چیز اس کی راہ میں حائل ہو اُسے ختم کر دیتا ہے۔ اگرچہ اس نظریہ سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا تھا تاہم عورتیں، جن کی رائے کا انحصار بجائے مشاہدہ کے شاعری پر تھا، سمجھتی تھیں کہ سچی اور عظیم محبت صرف ایک ہی دفعہ کی جاتی ہے ان کے خیال میں محبت ایک برق خرمن سوز تھی اور جس دل پر یہ بجلی گرتی تھی۔ وہ ویران، تباہ اور سوختہ ہو جاتا تھا اور پھر وہاں اور کوئی جذبہ یا خواب جاگزین نہیں ہو سکتا تھا۔

مارکوئیس نے بہت بار محبت کی تھی۔ اسلئے وہ بڑی زندہ دلی سے خواتین کے اس خیال کی تردید کر رہا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ آدمی پوری قوت اور جذبہ سے زندگی میں بارہا محبت کر سکتا ہے۔ تم ان لوگوں کی مثال دیتی ہو جو محبت کی خاطر مر گئے تاکہ یہ ثابت کر سکو کہ دوبارہ محبت کرنا ناممکن ہے۔ مرا جواب یہ ہے اگر وہ اس حماقت کے مجرم نہ ہوتے جسے خودکشی کہتے ہیں جس نے انہیں ایک اور موقع سے محروم کر دیا تو ضرور ان کا زخم بھر جاتا۔ اور وہ بار بار محبت کرتے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی فطری موت مرتے۔ محبت کرنے والے بالکل شرابیوں کی طرح ہوتے ہیں۔

جو ایک دفعہ پی لے وہ بار بار پیئے گا۔ جو ایک دفعہ محبت کا مزہ چکھ لے وہ دوبارہ محبت کرے گا۔ یہ صرف مزاج کی بات ہے۔

انہوں نے ڈاکٹر ما کو ثالث منتخب کیا۔ یہ ڈاکٹر ریٹائر ہو کر دیہات میں رہنے لگا تھا۔ انہوں نے اس سے درخواست کی کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرے دراصل اسکی اپنی کوئی رائے نہ تھی۔ "جیسا کہ مارکوئیس نے کہا ہے یہ تو انسان کی طبیعت پر منحصر ہے۔" "جہاں تک میرا تعلق ہے،" ڈاکٹر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے ایک ایسی محبت کا مشاہدہ کیا ہے جو پچپن سال تک رہی اور موت کے ساتھ ہی ختم ہوئی۔"

مارکوئیس سے تالی بجائی۔

"بہت خوب" ایک عورت نے کہا "اور اس طرح سے مرکز الفت ہونا کس قدر حسین ہے۔ پچپن سال تک زندہ محبت کی آغوش رہنا کتنی بڑی مسرت ہے۔ اسکی زندگی کس قدر کیف آور ہے جس سے اس طرح کی محبت کی جائے۔" ڈاکٹر نے ہنس کر کہا: "میڈم! آپ کو مغالطہ ہوا ہے کیونکہ اس محبت میں محبوب ایک مرد تھا۔ آپ اُسے جانتی ہیں وہ موسیو شوقے ہے جو دیہات کا دوا ساز ہے۔ اور جہاں تک عورت کا تعلق ہے اُسے بھی آپ جانتی ہیں۔ یہ وہی عورت ہے جو ہر سال یہاں کرسیاں بننے آیا کرتی تھی۔ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟"

عورتوں کی گرمجوشی ختم ہو گئی - ان کے چہروں سے بیزاری کے تاثرات ظاہر تھے - گویا ان کے خیال میں محبت صرف انہیں لوگوں کو ہو سکتی ہے جن میں فیشن ایبل لوگوں کو دلچسپی ہو

ڈاکٹر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا :

تین ماہ ہوئے مجھے اس عورت کے بسترِ علالت کے پاس بلایا گیا وہ قریب المرت تھی - وہ اس پرانی گاڑی میں آئی جو اس کے لئے گھر کی طرح تھی - اس کے ساتھ اس کے دوست دو بڑے کالے کتے اور ایک محافظ تھا گاڑی کو ایک چھوٹا سا گھوڑا جسے آپ نے اکثر دیکھا ہے کھینچ رہا تھا - پادری پہلے ہی سے موجود تھا - اس نے ہمیں اپنی وصیت کا کارپرداز بنایا - اور اپنی وصیت کا مطلب سمجھانے کے لئے اپنی داستانِ حیات سنائی میں نے اس سے زیادہ عجیب اور دل پر اثر کرنے والی کوئی کہانی نہیں سُنی -

اسکی ماں اور باپ دونوں کرسیاں بنا کرتے تھے اس کا کہیں گھر نہیں تھا - بچپن میں گندے چیتھڑوں میں گذر اوقات کرتی تھی - یہ لوگ قصبوں کے دروازے پر سڑک کے کنارے ٹھہر جاتے تھے اور گھوڑے کو چرنے کے لئے کھول دیتے تھے - ان کا کتا پنجوں پر ناک رکھ کر سو جاتا تھا اور بچی درختوں کے نیچے گھاس پر اپنے ماں باپ کے ساتھ کھیلتی تھی - تمام گرد و نواح کے لوگوں کی کرسیوں کی سیٹیں یہی لوگ مرمت کرتے تھے

اس ایمبولنس کار کی طرح کے مسکن میں کوئی بھی زیادہ گفتگو نہ کرتا تھا اس بات کا فیصلہ کرنے کے بعد کہ کون گھروں کا چکر لگا کر "کرسی درست کرالو" کی صدا لگائے گا وہ ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ کر بید کے گچھے بناتے تھے۔

جب بچی دور چلی جاتی یا کسی دیہاتی لڑکے سے شناسائی پیدا کرتی تو باپ پکار کر کہتا "ادھر آؤ اے نادان لڑکی" یہی محبت بھرے الفاظ تھے جو اس نے اپنی زندگی میں سنے۔

جب وہ بڑی ہوئی تو اُسے بوسیدہ اور مرمت طلب کرسیاں اکھٹی کرنے کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ وہ لڑکوں سے شناسائی پیدا کرتی تھی تو ان کے والدین بڑی سختی سے انہیں بلاتے اور کہتے "فوراً ادھر آؤ۔ خبردار! دوبارہ اس برہنہ پا لڑکی سے گفتگو نہ کرنا"

اکثر لڑکے اس پر پتھر پھینکتے کبھی کبھی معزز خواتین اُسے چند پیسے بھی دے دیتیں اور اسے توجہ سے دیکھ

ایک دن جبکہ وہ گیارہ سال کی تھی اسکی ننھے شوقے سے قبرستان کے قریب ملاقات ہو گئی۔ شوقے رو رہا تھا کیونکہ اس کے ساتھی نے اس کے دو سُو (قریباً دو آنے) چرا لئے تھے۔ اس ننھے سے خوشحال شہری کے آنسوؤں نے اُسے بیقرار کر دیا۔ کیونکہ وہ ان خوش قسمت انسانوں میں سے تھا جن

تک اسکی رسائی نہ تھی اور جو اس کے خیال میں نہایت ہی خوشی اور شادمانی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ اس کے قریب گئی اور رونے کا سبب معلوم ہونے پر اس نے اپنا سارا سرمایہ جو سات سُو پر مشتمل تھا اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ لڑکے نے آنسو پونچھتے ہوئے یہ رقم لے لی تو وہ خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ اور لڑکے کو گلے سے لگا لیا۔ کیونکہ وہ بڑی توجہ سے سِکّے گن رہا تھا اس لئے اس نے اُسے بغلگیر ہونے دیا جب اس نے دیکھا۔ کہ نہ تو اسے دھتکارا گیا ہے اور نہ ہی ایسا کرنے پر مار پڑی ہے تو اس نے ایک دفعہ اور اُسے سینے سے لگایا۔ اس کے بعد وہ بھاگ گئی۔

اس بیچاری کے دماغ میں جانے کیا کیا خیال آئے ہوں گے۔ کیا اُسے اس نادان سے اس لئے ربط تھا کہ اس نے اپنی ساری رقم اس کے حوالے کر دی تھی یا اس لئے کہ اس نے پہلی دفعہ کسی کو چوما تھا؟ خواہ کوئی بڑا ہو یا چھوٹا راز بہر حال راز ہے۔

کئی مہینوں تک وہ قبرستان کے اس کونے اور اس لڑکے کے خواب دیکھتی رہی۔ اُسے دیکھنے کی تمنا میں وہ اپنے والدین کو لوٹتی رہی کسی نہ کسی طریقہ سے ایک سُو ہتھیا لیتی۔ خواہ وہ کرسیوں کی اُجرت میں سے بچا کر رکھ لیتی خواہ وہ سودا لینے جاتی تو رکھ لیتی۔ جب وہ یہاں آئی تو اسکی جیب میں دو فرانک تھے مگر اس نے شفقی کو اپنے باپ کی دکان پر

رنگین بوتلوں کے پیچھے ٹیپ اور کنٹر کے درمیان پایا۔ وہاں وہ اسے اور بھی پیارا لگ رہا تھا، وہ مسحور ہو گئی اور رنگین پانی کی دلآویزی سے اس پہ وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔

یہ منظر اس کے دل میں نہ مٹنے والی یاد بنا رہا۔ اور جب اگلے سال اس نے اسے گولیاں کھیلتے ہوئے دیکھا تو وہ اس پر لپک پڑی۔ اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ کر اس شدت سے چومنا شروع کیا کہ وہ خوف سے چلانے لگا مگر اس نے اس کی برہمی کو دور کرنے کے لئے اپنی تمام پونجی اس کے حوالے کر دی۔ یہ ستر سینٹ کی اچھی خاصی رقم تھی۔ وہ اس رقم کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ اس نے پیسے لے لئے اور اُسے پیار کرنے کی اجازت دے دی۔ وہ جتنا پیار کرنا چاہے کر سکتی تھی۔

آئندہ چار سالوں میں اس نے اپنی تمام زائد آمدنی اس لڑکے کی نذر کر دی۔ اور وہ دیانتداری کے ساتھ چند پیسوں کے عوض قبول کر کے جیب میں ڈال لیتا تھا۔ کبھی اس کے پاس پندرہ سینٹ ہوتے اور کبھی چالیس۔ ایک دفعہ تو اس کے پاس صرف ساڑھے پانچ سینٹ تھے اور شرم اور تکلیف سے رو رہی تھی۔ لیکن ایسا ہونا ناگزیر تھا کیونکہ اس سال کساد بازاری کا دور دورہ تھا۔ آخری بار جب وہ اس سے ملی تو اس کے پاس پانچ فرانک کا سکہ تھا یہ بڑا اور گول سکہ دیکھ کر وہ خوشی

سے ہنس پڑا اور مطمئن ہو گیا۔

وہ اس کے سوا کسی اور چیز کے متعلق نہ سوچتی تھی۔ اور وہ قدرے بے صبری سے اس کا منتظر رہتا۔ اسکی آمد پر دوڑ کر اُسے ملنے جاتا تو اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگتا۔

اس کے بعد وہ کہیں نظر نہ آیا۔ مگر اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ لوگوں سے پوچھ کر پتہ لگایا کہ اسے گاؤں سے دور حصول تعلیم کے لئے بھیج دیا گیا ہے۔ وہ بڑی چالاکی سے اپنے والدین کو تعطیلات کے دوران میں یہاں لائی۔ مگر اُسے صرف پہلے سال کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد وہ دو سال تک اُسے نہ دیکھ سکی۔ دو سال کے بعد جب وہ نظر آیا تو وہ اس قدر بدل چکا تھا کہ وہ اُسے پہچان نہ سکی۔ وہ تنومند اور خوبصورت تھا۔ اور چمکدار بٹنوں والا کوٹ پہنے ہوئے بہت بارعب معلوم ہوتا تھا۔ وہ مغرورانہ انداز میں اس کے قریب سے گذر گیا۔ گویا اُس نے اُسے دیکھا ہی نہ تھا۔ اُسے اس کا بہت دُکھ ہوا اور وہ دو دن تک روتی رہی۔

وہ ہر سال یہاں آتی تھی۔ مگر نہ تو اُسے یہ جرأت تھی کہ شوقے کو سلام کرے اور نہ ہی شوقے اسکی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتا تھا۔ وہ اُسے بیحد چاہتی تھی۔ اُس نے مجھ سے کہا "ڈاکٹر! جہاں بھر میں مجھے وہی نظر آیا ہے۔ مجھے نہیں پتہ کہ اس کے سوا اور بھی کوئی مرد ہیں۔

اسکے والدین مر گئے - اب اس نے ایک کی بجائے دو کتے رکھ لئے۔
یہ کتے انتہائی طور پر خوفناک تھے کوئی ان کے قریب نہیں پھٹکتا تھا۔

ایک دن جب وہ اپنے محبوب گاؤں میں داخل ہوئی تو اس نے شوقے کی دکان سے ایک عورت کو نکلتے ہوئے دیکھا ۔اس عورت نے شوقے کا بازو تھام رکھا تھا ۔ وہ اسکی بیوی تھی - اب وہ شادی شدہ تھا۔

اسی شام اس نے تالاب میں کود کر خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر ایک شرابی اُسے پانی سے نکال کر شوقے کے دواخانے میں لے گیا۔ شوقے اپنا ڈریسنگ گاؤن پہنے نیچے اترا - اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ اُسے نہیں پہچانتا - اس نے اس کے کپڑوں کو ڈھیلا کر کے اس کے جسم پر مالش کرتے ہوئے سختی سے کہا : "تم کس قدر بیوقوف ہو ۔ کیا یہ ضروری ہے کہ تم اس طرح جانوروں کا سا مظاہرہ کرو ؟"

یہ الفاظ اُسے تندرست کرنے کے لئے کافی تھے کیا یہ کم تھا کہ اس نے اس سے گفتگو کی تھی - وہ مدت تک خوش رہی۔

وہ اس کے علاج کے پیسے نہیں لینا چاہتا تھا - مگر اس نے اصرار کر کے اُسے کافی معاوضہ ادا کیا - وہ کرسیاں بناتی رہی اور شوقے کی یاد میں گم رہی - وہ ہر سال اُسے دیکھنے آتی تھی - وہ تمام دوائیاں اُسی سے خریدتی تھی - اس طرح وہ اس سے گفتگو بھی کر سکتی تھی - اُسے دیکھ بھی سکتی

تھی اور اُسے اس حالت میں بھی پیسے دے سکتی تھی۔

یہ تو آپ سُن ہی چکے ہیں کہ وہ اسی سال موسم بہار میں مری ہے۔ جب وہ مجھے اپنی درد بھری داستانِ حیات سنا چکی تو اُس نے مجھ سے التجا کی کہ اس کی عمر بھر کی کمائی اس کے محبوب کی نذر کر دوں۔ کیونکہ اس نے اسی کے لئے محنت مشقت کی تھی۔ اس نے بچت کے لئے فاقے بھی کئے تھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ یہ دولت لے کر اس کے مرنے کے بعد کم از کم ایک دفعہ تو اسکو یاد کرے گا۔

اس نے مجھے دو ہزار تین سو ستائیس فرانک دیئے۔ میں نے ستائیس فرانک پادری کو رسومِ تدفین کے لئے دے دیئے اور جب اس نے مرنے سے پہلے آخری ہچکی لی تو میں باقی ماندہ رقم اپنے ساتھ لے آیا۔

اگلے دن میں شوقے کے ہاں گیا۔ میاں بیوی ناشتہ کرنے کے بعد ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے تھے۔ وہ سُرخ اور فربہ تھے۔ ان کے کپڑوں سے ادویات کی بُو آ رہی تھی وہ مطمئن تھے اور انہیں اپنی اہمیت کا احساس تھا۔ انہوں نے مجھے شراب پیش کی جو میں نے قبول کر لی۔ میں نے درد بھرے لہجے میں گفتگو شروع کی۔ میرا خیال تھا کہ اسے سن کر وہ روئیں گے۔

جب انہیں یہ پتہ چلا کہ کرسیاں مرمت کرنے والی آوارہ اور حقیر عورت اس سے محبت کرتی تھی۔ تو شوہر نفرت سے بے قابو ہو کر اپنی کرسی سے اچھلا گویا مرنے والی نے اس کی عزت، شہرت، اور اس وقار پہ ڈاکہ ڈالا تھا جو اُسے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز تھا۔ اسکی بیوی بھی غصہ سے بے تاب ہو گئی اور اس کے منہ سے بار بار بھکارن کا لفظ نکلا۔ اُسے طیش کے عالم میں اور کوئی لفظ نہ سوجھتا تھا۔ شوہر اٹھ کھڑا ہوا اور میز کے گرد غصے سے چکر کاٹنے لگا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا:

"ڈاکٹر صاحب! ذرا غور فرمائیے۔ کسی آدمی کے ساتھ اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے؟ اگر مجھے اس کی زندگی میں اس بات کا علم ہوتا تو میں اسے گرفتار کروا کر قید خانے بھجوا دیتا اور وہ عمر بھر رہائی نہ پا سکتی۔"

میں اپنے مقدس فریضہ کے انجام کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُسے کیا جواب دوں اور کیا کروں۔ مگر مجھے اپنے فرض کو پوری طرح ادا کرنا تھا۔ میں نے کہا "اس نے مجھے وصیت کی ہے کہ اسکی عمر بھر کی بچت تمہارے حوالے کر دوں۔ یہ دو ہزار تین سو فرانک ہیں۔ چونکہ جو کچھ میں نے آپ کو اس کے متعلق بتایا ہے وہ آپ کو بہت ناگوار گذرا ہے۔ اس لئے بہتر ہو گا کہ یہ رقم

کسی غریب شخص کو دے دی جائے "میاں بیوی دونوں میرا منہ دیکھنے لگے ۔ وہ صدمہ سے بے بس ہو گئے میں نے تمام نقدی جیب سے نکالی ۔ قسم قسم کے سکے تھے کچھ چاندی کے اور کچھ سونے کے جو ملک کے طول و عرض سے اکٹھے کئے گئے تھے ۔ پھر میں نے پوچھا : "آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے ؟ "

بیوی نے کہا "کیونکہ یہ مرنے والی کی آخری آرزو تھی اس لئے رقم لینے سے انکار کرنا مشکل بات ہے "

خاوند جو کسی قدر بد حواس ہو گیا تھا بولا :

"ہم اس رقم سے اپنے بچوں کے لئے کچھ خرید سکتے ہیں "

میں نے بے تعلقی سے کہا "جیسے آپ کی مرضی "

اُس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا :

"آپ یہ رقم ہمیں دے دیں ۔ کیونکہ وہ اسی لئے اسے آپ کے حوالے کر گئی تھی ۔ ہم اسے کسی کارِ خیر میں صرف کر سکتے ہیں "

میں نے رقم رکھدی ۔ سلام کیا اور واپس آ گیا دوسرے دن شوقے میرے ہاں آیا اور بے جھجک مجھ سے پوچھا :

"اُس عورت نے ایک گاڑی بھی تمہارے پاس چھوڑی ہو گی تم اس گاڑی کا کیا کرو گے "

"کچھ بھی نہیں"، میں نے کہا "تم چاہو تو اسے بھی لے جاؤ"
اُس نے جواب دیا: "بالکل! میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ میں اسے اپنے باورچی خانے کے ساتھ لگا لوں گا"

وہ واپس جا رہا تھا کہ میں نے اُسے آواز دے کر بلایا اور کہا:
"اُس نے ایک گھوڑا اور دو کتے بھی ترکہ میں چھوڑے ہیں۔ کیا تمہیں ان کی ضرورت ہے؟"

وہ حیران ہو کر کھڑا ہو گیا پھر بولا "نہیں مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں لے کر میں کیا کروں گا۔ تم جسطرح چاہو ان سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہو"

پھر اُس نے ہنستے ہوئے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھایا جو میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ ڈاکٹر اور دوا فروش ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہو سکتے۔

کتے میں نے اپنے گھر میں رکھ لئے اور پادری نے گھوڑا لے لیا۔ کیونکہ اس کے پاس جانوروں کے لئے ایک بڑا احاطہ ہے۔ گاڑی شوقے کو ایک چھوٹے سے کمرے کا کام دیتی ہے۔ اور رقم سے اس نے پانچ ریلوے بانڈ خرید لئے ہیں۔

یہی ایک عمیق محبت ہے جس کا میں نے اپنی زندگی میں مشاہدہ

کیا ہے "

ڈاکٹر خاموش ہوگیا - مارکوئیس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا : " بیشک محبت کرنا صرف عورتیں ہی جانتی ہیں "